قیمت: پانچ روپے

مسلمان سیاسی پارٹیوں کے نشانے پر

عام انتخابات سے قبل ہند و پاک میں جنگ کا خطرہ
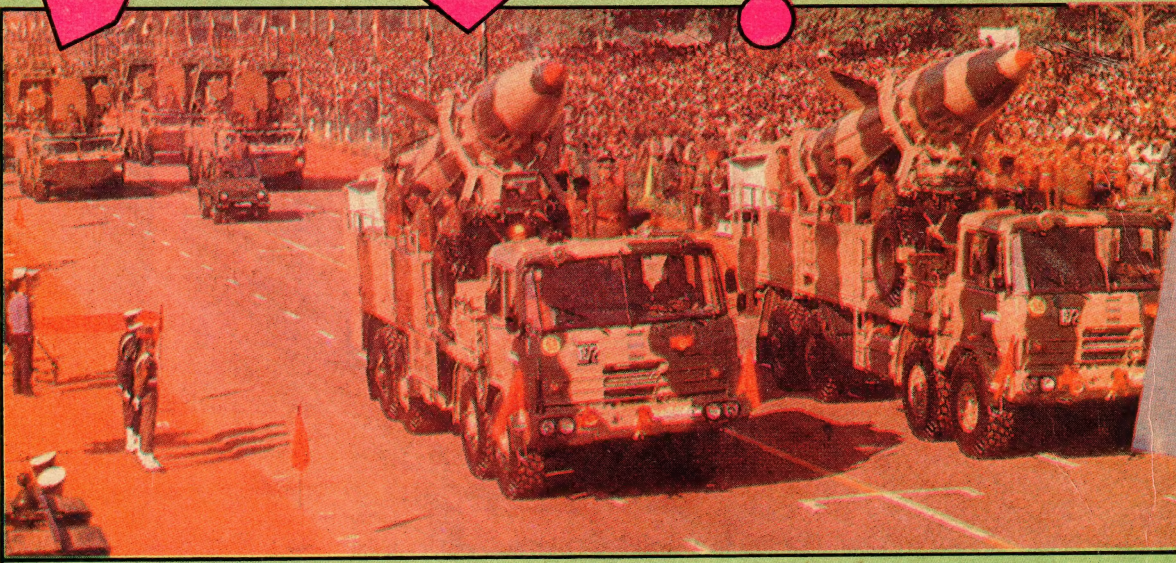
AUSTRALIA	A$ 3.50	DENMARK	D. KR. 14.00	ITALY	LIT. 3,000	NEW ZEALAND	NZ$ 4.95	SRILANKA	Rs 40
BANGLADESH	Taka 20	FRANCE	Fr 10	JAPAN		NORWAY	N. KR 12.00	SWEDEN	Kr 15
BELGIUM	Fr 70	FINLAND	F. MK 10.00	KOREA	W 1.800	PAKISTAN	Rs. 15	SWITZERLAND	Fr 3
BRUNEI	B$ 4.50	GERMANY	DM3.50	MALAYSIA	RM 3.00	PHILIPPINES	P 25	THAILAND	B 40
CANADA	C$.3.50	HONG KONG	HK$ 15.00	MALDIVES	Rf 12.00	SAUDI ARABIA	SR 3	U.K.	60p.
CHINA	RMB 12.50	INDONESIA	RP 3,400 (INC.PNN)	NETHERLANDS	G 3.30	SINGAPORE	S$ 2.50	U.S.A.	$1.25

عام انتخابات کے پیش نظر کانگریس کی "مسلمانوں کو بے وقوف بناؤ مہم"

کیا مسلمان کانگریس سے ملے زخموں کو بھول کر پھر اس کے دام میں پھنس جائیں گے؟

اس وقت جہاں غیر کانگریسی جماعتیں آپسی چپقلش، جوڑ توڑ اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچائی میں مصروف ہیں وہیں کانگریس ملک گیر سطح پر مسلمانوں کو پھر سے اپنے قریب کرنے کی کوششوں میں جٹ گئی ہے۔ دہلی ہو یا بمبئی، اترپردیش ہو یا مغربی بنگال ہر جگہ کانگریسی لیڈران مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے یا بہ الفاظ دیگر انہیں بے وقوف بنانے کے جتن کر رہے ہیں اور اجتماعات و کانفرنس منعقد کرواکر ان میں شریک ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کی ہمدردی میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے ہیں۔ ان لیڈروں کو مسلمانوں کی پسماندگی و زبوں حالی اور ان کے بے شمار مسائل کا "ادراک" ہوگیا ہے اور ان کی تقریروں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی زبوں حالی کو دور کرنے اور ان کے مسائل کو حل کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ اگر مسلمانوں نے ان کی خدمات سے فائدہ نہیں اٹھایا تو بہت خسارے میں رہیں گے۔ بھلا ہو عام انتخابات کا جس کی آمد سے انہیں مسلمانوں کا خیال آگیا۔

دراصل کانگریسی لیڈروں نے ایک بار پھر اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کردیا کہ وہ مسلمانوں کو ووٹ بینک سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے، الیکشن آرہا ہے تو ان کی خوشامد کرنی ہی پڑے گی۔ مرکزی وزراء مسٹر سیتارام کیسری نے دہلی اور بمبئی میں، مسٹر غلام نبی آزاد نے کلکتہ میں اور مسٹر ایس بی چوان نے بریلی میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انتخابی مہم کا بالواسطہ آغاز ہوگیا ہے اور کانگریسی لیڈران ووٹ کی بھیک مانگنے کے لئے مسلمانوں کے سامنے کشکول پھیلانے لگے ہیں۔ سیتارام کیسری نے پھر وہی پرانی لکیر پیٹی ہے کہ مسلمانوں کو ریزرویشن ملنا چاہئے۔ جب تک ریزرویشن نہیں ملے گا مسلمان سماجی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہے گا۔ گویا ریزرویشن کیا ہوا الہ دین کا چراغ ہوگیا ادھر مسلمانوں کے ہاتھوں میں آیا ادھر ان کی مفلوک الحالی نے دم توڑا، زبوں حالی و پسماندگی نے آخری سانس لی اور ترقی و خوشحالی نے ان کے قدم چومنے شروع کردئے۔

مسٹر سیتارام کیسری نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے 75 ویں جشن سالانہ یا پلاٹینم جوبلی تقریبات میں بولتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو صرف تحفظ یا روزی روٹی نہیں چاہئے بلکہ انہیں اقتدار کے ایوانوں میں لایا جانا چاہئے۔ اس کے بغیر ہندوستان کے مسلمان باعزت نہیں ہوسکتے۔ انہوں نے کہا کہ تقسیم وطن سے قبل سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب 26 فیصد تھا لیکن آج تین فیصد سے بھی کم ہوگیا ہے۔ ایسی حالت میں ریزرویشن لازم ہوجاتا ہے۔ اسی دن رات میں بمبئی میں ہونے والے جمعیۃ علماء ہند کے 25 ویں تین روزہ اجلاس میں مسٹر کیسری نے اپنی اس بات کو تفصیل سے پیش کیا اور کہا کہ مسلمانوں کی ترقی کے بغیر ملک کی ترقی نہیں ہوسکتی اور اگر کوئی حکومت مسلمانوں یا اقلیتوں کی حفاظت نہیں کرسکتی تو اسے اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی ان کی آبادی کے تناسب سے سرکاری ملازمتوں میں نمائندگی کے مطالبے کو بھی دوہرایا۔ اب کوئی مسٹر کیسری سے پوچھے کہ ایسی تقریروں کا مقصد مسلمانوں کو بے وقوف بنانا نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ کون سی حکومت ہے جس نے مسلمانوں کا تحفظ کیا اور تحفظ نہ کرنے پر وہ حکومت ختم ہوگئی۔ راؤ حکومت تو اپنے پانچ سال پورے کرنے جارہی ہے کہاں اسے ختم ہونا پڑا یا راؤ کو اقتدار سے کہاں بے دخل ہونا پڑا۔ اور تو اور کیا مسٹر کیسری نے اپنے آپ کو اقتدار سے الگ کیا۔ حکومت کے ایک ذمہ دار وزیر تو وہ بھی ہیں۔ انہوں نے ریزرویشن کے زبانی مطالبے کے علاوہ کیا کوئی عملی قدم بھی اٹھایا۔ اور پھر مسلمانوں کی ترقی کے بنا ملک کہاں پچھڑ رہا وہ تو مسلسل ترقی کر رہا ہے۔

کلکتہ میں منعقد ہونے والے مسلم کنونشن میں غلام نبی آزاد اور طارق انور

مسٹر کیسری کی مانند کلکتہ میں مرکزی وزیر سیاحت مسٹر غلام نبی آزاد نے بھی مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کا مطالبہ کیا۔ وہ مغربی بنگال قومی تنظیم کی طرف سے "مسلمانوں کے ایک قومی کنونشن" میں تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کے لئے ملازمتوں میں آبادی کے تناسب سے ریزرویشن ہونا چاہئے۔ صحیح معنوں میں آزادی ہمیں تبھی ملے گی جب تمام شہریوں کو اس کا پھل ملے۔ لیکن جب تک مسلمان اقتصادی اور سماجی طور پر پچھڑا اور پسماندہ رہے گا یہ ناممکن ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کو تعلیمی اور اقتصادی سطح پر پسماندہ قرار دینا چاہئے۔ مسٹر آزاد نے ریزرویشن کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے ملک کی جمہوریت کمزور نہیں ہوگی بلکہ بی جے پی کا دل ٹوٹ جائے گا۔

ادھر بریلی میں "اتحاد ملت" نامی ایک تنظیم کی دعوت پر وہاں گئے مسٹر ایس بی چوان نے اردو کی قصیدہ خوانی شروع کردی۔ انہوں نے اس موقع پر فرقہ پرست سیاست اور پاکستان کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ انہوں نے کہا کہ اردو والوں کو مایوس نہیں ہونا چاہئے اردو کے لئے ماحول سازگار ہے اور اس کا مستقبل تابناک ہے۔ لیکن انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اردو کا رسم الخط آسان کردینا چاہئے تاکہ سبھی افراد اسے لکھ پڑھ سکیں۔ گویا

باقی صـ [illegible] پر

کیا مسلم آبادی میں اضافہ کا سبب غربت و ناخواندگی ہے؟

1991ء کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی میں ہر دس سال پر 32.8 فیصد کا اضافہ ہوتا ہے جب کہ ہندو آبادی میں اضافے کی شرح 22.8 فیصد ہے۔ پاپولیشن کنٹرول کے نمونے کے طور پر پیش کئے جانے والے صوبے کیرالا میں بھی دونوں فرقوں کی آبادی میں اضافے کی شرح بالترتیب 25.89 اور 12.62 ہے۔ اور یہ شرح یہاں بھی قومی شرح سے آگے ہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم آبادی میں اضافہ کی رفتار ہندوؤں کے مقابلے میں ہمیشہ تیز رہی ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور تقسیم ملک کے ذمہ دار واقعات کی یاد ابھی لوگوں کے ذہن سے محو نہیں ہوئی اس لئے مسلم آبادی میں تیزی سے اضافے پر ہندو چوکنے ہوجاتے ہیں۔ یا تو اس مسئلہ کو بہت سنگین قرار دے کر اسے نظرانداز کردیا جاتا ہے یا یہ کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اس اضافے کی وجہ ناخواندگی اور غربت جیسی سماجی لعنتیں ہیں۔

دو فرقوں کی آبادی کی شرح اضافہ میں اس وسیع فرق کے اسباب تلاش کرنے کے بجائے غربت و ناخواندگی کے بندھے ٹکے فارمولے پر تکیہ کرنا ایک طرح کی فریب دہی ہے جس کی تصدیق کئی ترقی پذیر اسلامی ممالک کی آبادی کے اعداد و شمار سے ہوتی ہے جن میں غربت و ناخواندگی کی سطحیں مختلف ہیں۔ یہ اعداد و شمار "انسانی ترقی کی رپورٹ مجریہ 1995ء" سے ماخوذ ہیں جو اقوام متحدہ کے ترقیاتی منصوبے کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔

رپورٹ میں افغانستان، انڈونیشیا اور تیونس کو چھوڑ کر باقی پچیس ممالک میں اضافہ آبادی کی شرح ترقی پذیر ممالک کی اوسط شرح اضافہ سے زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ ان اسلامی ممالک میں شرح پیدائش بحرین، برونئی، کویت، قطر، تیونس، انڈونیشیا، ترکی اور متحدہ عرب امارات کے سوا ہر جگہ دیگر ترقی پذیر ممالک کے متوازی اوسط سے کہیں زیادہ ہے۔

بحرین، کویت، قطر اور امارات میں کم شرح پیدائش میں شرح پیدائش کا سبب مردوں اور عورتوں کی تعداد میں عدم تناسب ہے جہاں ہر سو مردوں پر 72، 76، 60 اور 48 عورتیں ہیں جبکہ ترقی پذیر ممالک کا اوسط تناسب 100 : 96 کا ہے۔ جب ہم رپورٹ میں دئے گئے ممالک کی آبادی کو غربت اور ناخواندگی کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان میں سے گیارہ ممالک کی شرح خواندگی، ہندوستان سے کہیں زیادہ ہے لیکن ہمارے مقابلے میں ان گیارہ میں سے آٹھ ممالک میں شرح پیدائش کافی زیادہ ہے اور یہی بات اضافہ آبادی کی روک تھام میں خواندگی کے کردار کو مشکوک بناتی ہے۔

اور اب غربت کے پہلو کی طرف آئیے۔ مذکورہ 28 ملکوں میں سے نو کی GDP انسانی ترقی کی رپورٹ میں درج نہیں ہے لیکن تاہم مالدیپ اور یمن کے علاوہ سات خاصے متمول سمجھے جاتے ہیں۔ ان ممالک کے علاوہ الجزائر، مصر، انڈونیشیا، ایران، اردن، ملیشیا، مراقش، موریتانیا، پاکستان، عمان، سعودی عرب، سنیگال، شام، تیونس اور ترکی GDP کے معاملے میں ہندوستان سے آگے ہیں۔ اس کے باوجود ان ممالک کی آبادی میں اضافہ 1960ء سے 1992ء کی مدت کے دوران ہندوستان کے مقابلے میں دو فیصد زائد رہا ہے۔

ان میں سے بیس ممالک ایسے ہیں جہاں فی کس جی ڈی پی تمام ترقی پذیر ممالک کی اوسط جی ڈی پی سے زیادہ ہے اور صرف دو ممالک ایسے ہیں جن کی جی ڈی پی تمام ترقی پذیر ممالک کی اوسط جی ڈی پی سے کم ہے۔ 28 ممالک کے اس جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم مسلم آبادی میں اضافے کی بڑھتی ہوئی شرح اور خواندگی یا غربت کے عوامل کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ اس لئے یہ خیال خاصا گمراہ کن ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کی اونچی شرح کی وجہ مسلم فرقہ کی غربت و ناخواندگی ہے۔

آڈوانی کی ناکام قیادت سے نجات پانے کے لئے سنگھ پریوار کا نیا منصوبہ

واجپئی وزیراعظم آڈوانی صدر جمہوریہ

بی جے پی کی قسمت کا ستارہ ابھی گہن سے باہر نہیں نکلا ہے۔ گجرات کے بعد مہاراشٹر میں بغاوت کے تاریک سائے لہرانے لگے ہیں۔ بی جے پی کے قومی جنرل سکریٹری اور مہاراشٹر کے معاملوں کے انچارج پرمود مہاجن کے خلاف زبردست محاذ آرائی شروع ہوگئی ہے جس نے مرکزی قیادت کی نیند حرام کردی ہے۔ بی جے پی خود کو اقتدار میں لانے کے لئے بے چین ہے اور پارٹی میں ابھر رہی بے اطمینانی سے تشویش میں مبتلا ہے۔ پارٹی لیڈروں کو خطرہ ہے کہ اگر بے چینی و بے اطمینانی کو دبایا نہیں گیا تو آئندہ عام انتخابات میں برسراقتدار آپانا بہت مشکل ہوجائے گا۔ اور اگر سختی سے ناراض گروپوں کو دبانے کی کوشش کی گئی تو گجرات کی تاریخ سے کئی ریاستوں میں واسطہ پڑسکتا ہے۔ اترپردیش، مہاراشٹر، راجستھان اور گجرات میں اندرونی چپقلش اور بغاوت نے ایڈوانی اینڈ کمپنی کو دن میں تارے دکھادئے ہیں۔ سنگھ پریوار اور بی جے پی کی مرکزی قیادت اس صورت حال سے بہرحال میں نجات پانا چاہتی ہے۔ اس لئے اب بی جے پی میں ایڈوانی کے بجائے واجپئی کی امیج کو پیش کیا جارہا ہے۔ ایڈوانی کا یہ بیان کہ اگر بی جے پی جیتتی ہے تو وزیراعظم واجپئی ہوں گے چلتا پھرتا یا بے سوچا سمجھا بیان نہیں ہے۔ یہ بیان ایک منظم حکمت عملی کا نتیجہ ہے اور یہ حکمت عملی تنہا ایڈوانی کی نہیں بلکہ پوری بی جے پی اور سنگھ پریوار کی ہے۔

دراصل ایڈوانی کی مقبولیت اس وقت تک تھی جب تک رام جنم بھومی کا ایشو زندہ تھا اس ایشو کے مرتے ہی ایڈوانی کی مقبولیت بھی دم توڑنے لگی ہے اور آج حالت یہ ہے کہ پارٹی ورکر ایڈوانی کے مقابلے میں واجپئی کو زیادہ پسند کرنے لگے ہیں اور وزیراعظم کی حیثیت سے وہ واجپئی ہی کو دیکھ رہے ہیں نہ کہ ایڈوانی کو۔ حکمت عملی کے مطابق اگر آئندہ عام انتخابات میں بی جے پی کو اکثریت حاصل ہوجاتی ہے تو وزیراعظم ایڈوانی کو بنایا جائے گا لیکن اگر کسی بھی پارٹی کو اکثریت نہیں ملتی ہے، ھنگ یعنی معلق پارٹی عالم وجود میں آتی ہے اور بی جے پی واحد بڑی پارٹی کی حیثیت سے ابھرتی ہے تو واجپئی کو وزیراعظم کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ کیونکہ ان کی امیج ایک ماڈریٹ اور معتدل مزاج رہنما کی ہے۔ ایڈوانی کے مقابلے میں وہ تعلیم یافتہ اور بی جے پی سے باہر کے لوگوں کو اپنی جانب زیادہ متوجہ کرتے ہیں۔ ان کا ماضی بھی ایسا رہا ہے کہ جسے اور تو اور مسلمانوں نے بھی پسند کیا ہے۔ جنتا پارٹی حکومت میں جب وہ وزیر خارجہ تھے تو انہوں نے ہندو پاک کے درمیان تعلقات کو نارمل بنانے کے لئے جو کچھ کیا تھا اس کا دوسروں کے ساتھ تو مسلمانوں نے بھی خیر مقدم کیا تھا۔ بی جے پی کے لیڈروں کا خیال ہے کہ ایسی صورت میں واجپئی کو قبول کرنے میں کسی کو مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔

معلق پارلیمنٹ کی صورت میں بابری مدد کے بغیر کوئی بھی پارٹی حکومت نہیں بنا پائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بی جے پی نے ایسے حالات میں واجپئی کو وزیراعظم کے طور پر پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ پارٹیوں کی زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کی جاسکے۔ گذشتہ دنوں ایڈوانی پارٹی ورکروں کی میٹنگوں اور پریس کانفرنسوں تک میں یہ کہتے پھر رہے تھے کہ وزیراعظم واجپئی کو بنایا جائے گا۔ اس کا ایک مقصد پارٹی ورکروں کو یہ بتانا بھی ہے کہ ان کے جذبات کی ہم قدر کر رہے ہیں اور اگر وہ واجپئی کو پسند کرتے ہیں تو وہی وزیراعظم ہوں گے۔ ایسا کرکے مرکزی قیادت انتشار و بے چینی کی ہوا کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے اس کا اعلان بار بار ایڈوانی سے کروایا گیا کسی اور لیڈر سے نہیں۔ کیونکہ ایڈوانی وزیراعظم بننے کا خواب برسوں سے دیکھ رہے ہیں اور بی جے پی میں بھی انہیں اس حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ایڈوانی سے بیان دلواکر یہ واضح کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ مرکزی سطح پر بی جے پی میں کوئی اختلاف و انتشار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وزیراعظم کے عہدے جیسے اہم مسئلہ پر بھی ہم سب متفق ہیں۔ باوثوق ذرائع کے مطابق ایڈوانی سے یہ سمجھوتہ اس شرط پر ہوا ہے کہ انہیں صدر جمہوریہ بنایا جائے گا۔ اس سے کم پر ایڈوانی راضی ہونے کو تیار نہیں تھے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس حکمت عملی سے پارٹی میں پیدا ہونے والی بے اطمینانی کی لہر کو دبایا جاسکتا ہے۔

دس سے بارہ نومبر تک بمبئی میں بی جے پی کا کونشن ہورہا ہے اس موقع پر مہاراشٹر میں انتشار بی جے پی کے لئے نیک شگون نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ عام انتخابات میں وہ کس طرح اترتی ہے۔

نہ قدم بوسی نہ جبیں سائی نہ گل دستے نہ وزراء کی قطاریں

تاریکی میں ڈوبی رہی چندراسوامی کی سالگرہ

متنازعہ تانترک چندرا سوامی کی شخصیت اور ان کے آشرم پر آیا "آسیبی سایہ" ابھی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ گہرا ہوتا جارہا ہے۔ 31 اکتوبر کو سوامی کے جشن سالگرہ پر بھی اس آسیب کی منحوسیت طاری رہی اور عین دربار کے وقت ان کا آشرم تاریکی میں ڈوب گیا۔ بجلی تو میونسپل کارپوریشن کے افسران نے پہلے سے کاٹ رکھی تھی، جنریٹر سیٹ بھی آسیبی منحوسیت سے بچ نہیں سکے۔ ان میں خرابی پیدا ہوگئی اور چندرا سوامی کو اپنے آشرم کی تیسری منزل کے وسیع ہال میں جہاں کہ جشن منعقد تھا، شمسی نظام سے روشنی مستعار لینی پڑی۔ بین الاقوامی تانترک اس موقع پر بھی کچھ نہیں کرسکے اور ان کا تنتر منتر منحوسیت کے دبیز سائے کو ان سے دور کرنے میں ناکام رہا۔

گذشتہ برسوں کے سوامی کے جشن سالگرہ انتہائی یادگار ہوا کرتے تھے۔ قد آور سیاستدانوں کا ہجوم ہوتا تھا اور مرکزی وزراء و وزراء اعلی ان کی چوکھٹ پر جبیں سائی کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ آشیرواد لینے کی ایسی ہوڑ لگی رہتی تھی کہ ہر لیڈر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے بے چین ہوا کرتا تھا۔ گلدستوں کی بھرمار ہوتی تھی اور آشرم کے باہر انتہائی اہم شخصیات کی گاڑیاں قطار اندر قطار کھڑی ہوا کرتی تھیں، لیکن ان کا 47 واں جشن سالگرہ گذشتہ برسوں کے سالگرہ سے یکسر مختلف تھا۔ نہ لیڈر، نہ وزیر نہ وزیراعلی نہ وزیر بننے کے خواہاں سیاستداں، نہ گاڑیاں نہ گلدستے۔ بس چندرا سوامی اور سبرامنیم سوامی اور ایک سکھ لیڈر جتھیدار رچھپال سنگھ، وہ وزراء جو گذشتہ برسوں میں ان کی قدم بوسی کیا کرتے تھے اور ان کے آشیرواد کو نیک شگون سمجھتے تھے وہ اس بار سوامی سے دامن چھڑا چکے تھے۔ نہ بوٹا سنگھ نہ دگ وجے سنگھ۔ نہ کمل ناتھ نہ دوسرے وزراء۔ رات کے آٹھ بجے جب چندرا سوامی اپنا دربار لگائے بیٹھے تھے تو اسی وقت جنریٹر نے کام کرنا بند کردیا۔ پورا آشرم تاریکی میں غرق ہوگیا اور جشن سالگرہ کی "رونق" ختم ہوگئی۔ یہ جشن بھی یادگار ہی تھا البتہ اسے سوامی جی زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ شاید ایسے جشن سالگرہ کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

چندرا سوامی کو جین کمیشن نے پانچ دنوں کی جرح کے بعد چھٹی دے دی ہے لیکن دہلی کے وزیراعلی مدن لال کھورانہ کمر کس کر میدان میں آگئے ہیں، انہوں نے ان کے آشرم کو منہدم کرنے کا حکم دے دیا ہے اور بجلی کا کنکشن بھی کاٹ دیا گیا ہے۔ کیونکہ اطلاعات کے مطابق آشرم کی تعمیر اور بجلی کے کنکشن میں مبینہ طور پر بد عنوانیاں کی گئی ہیں۔ یہ آشرم جو دہلی کے قطب انسٹی ٹیوشنل علاقہ میں واقع ہے۔ چودہ سو مربع گز پر پھیلا ہوا ہے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق ایک سو گز پر کھڑا ہوا ایک کثیر منزلہ ڈھانچہ جو کہ آشرم کی حدود ہی میں ہے، غیر قانونی بتایا جاتا ہے۔ وزیراعلی نے اس پورے معاملے کی جانچ کا حکم دیا ہے۔ گویا مسٹر کھورانہ نے سوامی کی 47 ویں سالگرہ پر انہیں یہ شاندار تحفہ پیش کیا۔

اس مبینہ غیر قانونی تعمیر اور بجلی کنکشن پر انہیں نوٹس بھیج دیا گیا ہے۔ یہ نوٹس رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال کیا گیا ہے۔ اگر ایک ہفتے میں کوئی جواب نہیں آیا تو دوسرا نوٹس بھیجا جائے گا۔ پندرہ دن کے بعد بھی اگر کوئی جواب نہیں آیا تو قانونی کارروائی کی جائے گی۔ نوٹس عام طور پر خود لے جاکر حوالے کیا جاتا ہے یا پھر عمارت کی دیوار پر اسے چسپاں کردیا جاتا ہے۔ دہلی میونسپل کارپوریشن کے افسران کا کہنا ہے کہ ہم نے ایسا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن نہ تو کسی نے نوٹس لیا اور نہ ہی چسپاں کرنے دیا۔ اس لئے ہم نے مجبور ہوکر اسے بذریعہ ڈاک ارسال کیا ہے۔

دریں اثنا، یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وزیراعظم راؤ نے سی بی آئی کے افسران کو ہدایت دی ہے کہ وہ سوامی کے خلاف جانچ کا کام بغیر خوف و جھجک کے کریں۔ یہ حکم انہوں نے اس فائل کو پڑھنے کے بعد دیا جس پر ان کے آفس کے

باقی صفحہ 12 پر

حسن ترابی مغرب اور مغرب نواز عناصر کی آنکھوں کا روڑہ

سوڈان کی اسلامی حکومت کے خلاف زبردست محاذ آرائی

غریب ہونے کے باوجود سوڈان آج مغرب اور مشرق کے مغرب نواز عناصر کی آنکھوں میں بری طرح کھٹک رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی مدد کے بغیر ایک آزاد اسلامی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے سوڈان نے اپنے بہت سارے اندرونی مسائل یا تو حل کرلئے ہیں یا انہیں حل کرنے کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔ فوجی حکومت کو اخوانی رہنما ڈاکٹر حسن ترابی کی حمایت کو دراصل ساری کامیابیوں کا ذمہ دار قرار دیا جارہا ہے۔ ترابی کی شخصیت بڑی کشش رکھتی ہے ملک کا پڑھا لکھا طبقہ خصوصا نوجوان ان کے سب سے بڑے پیروکار ہیں۔ خرطوم کی اسلامی حکومت نے بھی ان نوجوانوں کے مسائل حل کرنے میں خصوصی دلچسپی لی ہے۔ اس کے علاوہ سوڈانی زراعت پر خصوصی توجہ دے کر فوجی حکومت نے سوڈان سے بھوک اور قحط کا تقریبا خاتمہ کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے جنوب میں رہنے والے عیسائی باغیوں کو بھی یہ محسوس ہونے لگا کہ اب مرکزی حکومت کے خلاف ان کی ناکام جدوجہد کبھی کامیاب نہ ہوسکے گی۔ چنانچہ انہوں نے مذاکرات میں عافیت سمجھی۔ نتیجتاً پچھلے 6 ماہ سے جنگ بندی کے ایک معاہدے پر کامیابی سے عمل ہورہا ہے۔

سوڈان کی یہ کامیابی خصوصا ایک اسلامی قیادت کی رہنمائی میں، مغرب اور اس کے ہم نواؤں کو گوارا نہیں ہے۔ کیونکہ کامیابیاں علاقے کے دوسرے ممالک کی اسلامی تحریکوں کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ کررہی ہیں۔ جو براہ راست مغرب کے لئے اس کی اسلام دشمن پالیسی کی وجہ سے خطرہ ہیں۔ نتیجتاً مغرب کے کان کھڑے ہونے تھے۔

اگرچہ سوڈان نے دہشت گردی کی نہ صرف مذمت کی ہے بلکہ اس ضمن میں فرانس اور دوسرے ممالک سے بعض معاملات میں تعاون بھی کیا ہے لیکن اس سب کے باوجود مغرب اسے دہشت گرد ملک قرار دیتا ہے۔ خاص طور سے امریکہ اس معاملے میں سب سے آگے ہے۔

بعض خلیجی ممالک سوڈان سے اس وقت ناراض ہوگئے جب جنگ خلیج کے دوران سوڈان نے ایک آزادانہ پالیسی اختیار کرتے ہوئے خلیجی بحران کو جنگ کے بجائے مذاکرات کے ذریعہ حل کرنے کی حمایت کی۔ اس "جرم" کی پاداش میں بے شمار سوڈانی خلیجی ممالک سے نکال دئے گئے۔

حسن ترابی اور کرنل بشیر ایک جلوس کے دوران

سوڈان کی اسلامی پالیسیوں کی کامیابی سے اس کے پڑوسی اس لئے پریشان ہوگئے کہ ان ملکوں میں پہلے سے کام کر رہی اسلامی تحریکوں کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا۔ واضح رہے کہ سوڈان کے اکثر پڑوسی ممالک میں نااہل حکمراں برسراقتدار ہیں جن کے خلاف اسلامی تحریکیں سرگرم عمل ہیں۔ سوڈان اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ ان کی مالی و حربی مدد کرسکے لیکن اس کے باوجود اس پر اسی قسم کے الزام لگائے جاتے رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ سوڈان کو گھیرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

سب سے پہلے مصر نے اپنے مغربی آقاؤں کے اشارے پر سوڈان پر دہشت گردی کا الزام لگایا۔ مصری صدر نے اپنے اوپر ہوئے ناکام قاتلانہ حملہ کے لئے بھی بغیر کسی ثبوت کے خرطوم پر الزام عائد کیا کہ وہی اس کے لئے ذمہ دار ہے۔ چونکہ یہ حملہ ایتھوپیا کے دارالحکومت عدیس ابابا میں ہوا تھا اس لئے فطری طور پر وہ بھی ناراض ہے۔ اس نے تین سوڈانی شہریوں کو حسنی مبارک پر قاتلانہ حملے کے جرم میں اپنے حوالے کرنے کا بھی مطالبہ کیا ہے۔

لیکن سب سے زیادہ ناراض ڈھائی سال قبل آزاد ہونے والا ملک اریٹریا نظر آتا ہے۔ اریٹریا میں مسلمان اور عیسائی کم و بیش برابر کی تعداد میں بتائے جاتے ہیں۔ خانہ جنگی کے دنوں میں بہت سارے لوگ اریٹریا سے بھاگ کر سوڈان میں پناہ گزیں ہوگئے تھے۔ ان کی تعداد ساڑھے پانچ لاکھ ہے اور ان کی اکثریت مسلمان ہے۔ اریٹریا کے موجودہ حکمرانوں کو اندیشہ ہے کہ یہ مسلمان سوڈان کے اسلامی ماحول اور انقلاب سے متاثر ہوکر جب دوبارہ اریٹریا میں آباد ہوں گے تو وہاں کی اسلامی تحریک سے وابستہ ہوجائیں گے۔ اریٹریا کے صدر یہ الزام بھی عائد کرتے ہیں کہ ان پناہ گزینوں کی آڑ میں سوڈان اپنے تربیت یافتہ ایجنٹ بھی بھیج سکتا ہے تاکہ اریٹریا کے مسلمانوں کی مدد کرکے ملک سے "عیسائی غلبے" کو ختم کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ اریٹریا کھل کر خرطوم کی مخالفت کر رہا ہے۔ گذشتہ دنوں اس نے سوڈان کے تمام اپوزیشن گروپوں کی ایک کانفرنس کرکے انہیں متحد ہوکر جدوجہد کرنے کی اپیل کی تھی۔ اریٹریا کے صدر نے حال ہی میں یہ اعلان بھی کیا ہے کہ وہ ہر اس گروہ کی مدد کریں گے جو موجودہ سوڈانی حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرسکے۔

اگر دیکھا جائے تو کینیا کے علاوہ سوڈان کے تمام ہی پڑوسی اس وقت اس کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف ہیں۔ ان میں سے کچھ داخلی مسائل ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ بعض یا تقریبا سبھی مغرب کی نظر میں سرخرو ہونے کے لئے بھی خرطوم کے خلاف الزام تراشی میں مصروف ہیں۔ بلاشبہ یہ خرطوم کے ارباب اقتدار خصوصا حسن ترابی کے لئے آزمائش کی گھڑی ہے۔ •

فلپائنی مسلمان عیسائی حکومت سے آزادی کی جنگ میں مصروف

فلپائن بہت سے جزائر پر مشتمل ایک عیسائی اکثریت کا ملک ہے لیکن اس کے ایک صوبے موگندناؤ میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ یہ صوبہ جزیرہ منڈناؤ میں واقع ہے۔ مدت دراز سے مسلمان اس صوبے کی آزادی کے لئے برسرپیکار ہیں۔ فلپائن کی کل آبادی ساڑھے چھ کروڑ ہے جس میں سے مسلمان ایک کروڑ سے کچھ کم ہیں۔

فلپائن کی دریافت کے بعد باہری دنیا سے یہاں پہنچنے والے سب سے پہلے مسلمان تاجر تھے۔ ان مسلم تاجروں کی ایمانداری، دیانتداری اور دوسری اعلی خصوصیات سے متاثر ہوکر لوگ تیزی سے مسلمان ہونے لگے لیکن یہ سلسلہ اس وقت رک گیا جب اسپین نے بزور طاقت فلپائن پر قبضہ کرکے اسے اپنی کالونی بنالیا اور اس طرح طاقت کے بل پر مقامی آبادی کو عیسائی بنانا شروع کردیا۔ اس وقت سے مسلمانوں کو طرح طرح سے ستایا جاتا رہا ہے۔

اپنے خلاف مسلسل زیادتی کو ختم کرنے کے لئے مسلمانوں نے بالآخر ہتھیار اٹھالیا۔ وہ مورو نیشنل لبریشن فرنٹ کے تحت جدوجہد کرنے لگے مختلف مواقع پر فرنٹ کے مرکزی حکومت سے مذاکرات ہوئے جو ہمیشہ ناکام ہوتے رہے۔ لیکن اس وقت فرنٹ اور مرکزی حکومت کے درمیان مذاکرات ہورہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اس بار انہیں کامیابی بھی ملے گی۔ دراصل مورو لبریشن فرنٹ نے مکمل آزادی سے کم محدود خود مختاری پر آمادگی ظاہر کردی ہے جسے ماننے کے لئے مرکزی حکومت تیار نظر آتی ہے۔

لیکن مکمل آزادی سے دست برداری فرنٹ کے لئے مہنگی ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس کا ایک خاطر خواہ حصہ الحاج مراد کی قیادت میں الگ ہوگیا اور مورو اسلامک لبریشن فرنٹ کے نام سے اپنی الگ تنظیم بنالی اور مسلمانوں کے اس پرانے مطالبے پر قائم ہے کہ ان کے لئے ایک علیحدہ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے۔

الحاج مراد اسلامک لبریشن فرنٹ کے فوجی کمانڈر ہیں۔ ان کا مرکزی کیمپ صوبہ موگندناؤ کی ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ جس کی حفاظت کے لئے دوسرے ہتھیاروں کے علاوہ اینٹی انٹرکرافٹ گن بھی نصب ہیں۔ اس کیمپ کا دورہ کرنے والے نامہ نگار اور فلپائنی فوج کا کہنا ہے کہ حاجی مراد کے پاس ہتھیاروں کی کمی نہیں ہے۔ ان کی کمانڈ میں تین ہزار سے زائد تربیت یافتہ گوریلے ہر وقت کارروائی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ فلپائنی فوج کا اندازہ ہے کہ مراد کسی بھی وقت 9 ہزار افراد تک فوجی مقاصد کے لئے تیار کرسکتے ہیں اور ان کے گوریلے دوسرے گروہوں سے زیادہ مسلح ہیں۔

> حاجی مراد کا کہنا ہے کہ وہ اور دوسرے تمام فلپائنی مسلمان امن کے خواہاں ہیں۔ لیکن فلپائنی حکومت نے ہمیشہ یہ تاثر دیا ہے کہ وہ امن کے بجائے جنگ کے لئے آمادہ ہے۔

الحاج مراد سے ملنے والوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک گوریلا لیڈر سے زیادہ یونیورسٹی پروفیسر لگتے ہیں۔ ان کا گھران کے اپنے مرکزی فوجی کیمپ میں واقع ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا مکان ہے جس کے سامنے ایک خوبصورت لان ہے۔ الحاج مراد کے کمرے میں ایک کمپیوٹر کے علاوہ چاروں طرف قاعدے سے سجائی ہوئی کتابیں نظر آتی ہیں۔ یہ ساری کتابیں جنگ سے متعلق ہیں۔ حاجی مراد کا کہنا ہے کہ وہ اور دوسرے تمام فلپائنی مسلمان امن کے خواہاں ہیں۔ لیکن فلپائنی حکومت نے ہمیشہ یہ تاثر دیا ہے کہ وہ امن کے بجائے جنگ کے لئے آمادہ ہے۔ چنانچہ حاجی مراد کہتے ہیں کہ باوقار امن جنگ ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

جزیرہ منڈناؤ کے تمام قابل ذکر شہروں کی اکثریت عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ ان لوگوں کا صوبے کی معاشیات اور بیوروکریسی پر قبضہ ہے۔ فطری طور پر اپنی مراعات کو قائم و دائم رکھنے کے لئے یہ لوگ جنگ کے بجائے امن چاہتے ہیں۔ یہ لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ صوبے کو ترقی کے لئے امن کی ضرورت ہے۔ حاجی مراد ان کے جواب میں کہتے ہیں کہ امن تو وہ بھی چاہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ گاؤں میں رہنے والے غریب مسلمانوں کی معاشی ترقی بھی چاہتے ہیں جس کے لئے عیسائی آبادی تیار نظر نہیں آتی۔

الحاج مراد سے بھی زیادہ خطرناک سیاف گروپ ہے جس نے آئیل میں 55 لوگوں کو ایک حملے کے بعد قتل کردیا تھا۔ یہ گروہ بھی مورو نیشنل لبریشن فرنٹ کی امن مساعی کا مخالف ہے اس نے تو باقاعدہ نیشنل فرنٹ کے صدر کو قتل کرنے کی دھمکی دے رکھی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود نیشنل فرنٹ کے سربراہ جناب سیوری حکومت سے مذاکرات جاری رکھے ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ فرنٹ اور حکومتی فوج کے درمیان 1993ء سے جنگ بندی ہے۔ فرنٹ کو اسلامی کانفرنس تنظیم میں مبصر کی حیثیت حاصل ہے جو خود بھی امن کی خواہاں ہے۔

لیکن سیوری کے سامنے بہت ساری دشواریاں ہیں۔ فیدل راموس، فلپائنی صدر کی اس بات سے وہ متفق ہیں کہ جنگ بندی کرکے صوبے اور مسلمانوں کی ترقی پر توجہ دی جائے لیکن اسی کے ساتھ انہیں اندیشہ ہے کہ امن کی راہ پر چلتے ہوئے اگر وہ دور چلے گئے تو ممکن ہے مسلمان انہیں چھوڑ کر دوسرے زیادہ انقلابی گروہوں میں شامل ہوجائیں۔ اس امکان کے تصور سے نہ صرف جناب سیوری بلکہ فلپائنی حکومت بھی کانپ اٹھتی ہے۔ کیونکہ جنگ دوبارہ بڑے پیمانے پر بھڑکتی ہے تو اس بار یہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہوگی۔ •

اسرائیل یروشلم کو اپنا دارالحکومت بنالے

امریکی کانگریس میں بل پاس، یاسر عرفات کی شرمناک شکست

25 اکتوبر کو امریکی کانگریس نے یروشلم کو 1999ء تک اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرنے اور امریکی سفارت خانے کو تل ابیب سے وہاں لے جانے سے متعلق ایک بل پاس کرکے اپنی اسرائیل نوازی کا ثبوت ایک بار پھر فراہم کیا ہے۔ کیا وہ عرب جو امریکہ کو "امن کا ایماندار ثالث" کہتے ہوئے نہیں تھکتے اس واقعے سے کوئی سبق لینے کو تیار ہیں اور کیا یاسر عرفات اب بھی اسی راہ ذلالت پر گامزن رہیں گے؟ آثار بتاتے ہیں کہ عرب لیڈروں بالخصوص عرفات کے رویے میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔

یہ بل جب کانگریس کے سامنے پیش ہوا تو کلنٹن انتظامیہ نے اس کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا۔ صدر کا کہنا تھا کہ ایسے کسی بھی اقدام سے مغربی ایشیا میں امن کے مشن کو نقصان پہنچے گا۔ اس اندیشے سے کہ کہیں صدر اسے ویٹو نہ کردیں یا پھر اس خوف سے کہ کہیں بل کی حمایت میں دو تہائی ووٹ حاصل نہ ہوسکے۔ بل کے حامیوں نے اسے کافی نرم بنا دیا تھا۔ اس بل کو پیش کرتے ہوئے اس پر ڈیموکریٹک اور ری پبلکن دونوں پارٹیوں کے 67 سینٹ ممبروں نے دستخط کئے تھے۔ بل میں یہ الفاظ شامل کردئے جانے کے بعد کہ صدر کو امریکی مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے ہر چھ ماہ بعد اس کی میعاد بڑھانے کی اجازت ہوگی، اس کی حمایت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ سینٹ نے پانچ کے مقابلے 93 ووٹ سے اور مجلس نمائندگان نے 37 کے مقابلے 374 ووٹ سے اسے پاس کردیا۔ اس بھاری اکثریت کا مطلب ہے کہ صدر اگر اسے ویٹو کریں بھی تو بے فائدہ ہوگا کیونکہ دوبارہ اسے دو تہائی اکثریت سے پاس کردیا جائے گا جسے صدر ویٹو نہ کرسکیں گے۔

اس بل کے پاس ہونے کے فوراً بعد صدر کلنٹن نے اسے ایک غلطی قرار دیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس بل کو ویٹو کرنا کار عبث ہوگا۔ اس کے بجائے صدر نے کہا کہ وہ چھ ماہ کی مہلت سے اس کی میعاد میں توسیع کرنے کی چھوٹ کو استعمال

> ہوا کے رخ کا اندازہ کرکے اب یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں رہا کہ یاسر عرفات اپنی بقا کے لئے اس مقدس شہر کو بھی یہودیوں کے حوالے کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے لیکن کیا عالم اسلام اسے بھی قبول کرلیگا۔

کرتے ہوئے مغربی ایشیا امن مشن کو پہنچے نقصان کو کم کرنے کی کوشش کریں گے۔

صدر کلنٹن نے اپنی انتخابی مہم کے دوران وعدہ کیا تھا کہ وہ جیت کے بعد یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرکے امریکی سفارت خانہ وہاں منتقل کردیں گے۔ لیکن صدر بننے کے بعد وہ اس وعدے سے پھر گئے۔ ایسا ریپبلکن صدور بھی کرتے رہے ہیں۔ دراصل امریکی کانگریس میں ہمیشہ اس خیال کو زبردست حمایت حاصل رہی ہے لیکن دونوں ہی ڈیموکریٹک اور ریپبلکن صدور آفس میں آنے کے بعد اس کی مخالفت کرتے رہے ہیں تاکہ ان عربوں سے ان کے تعلقات ختم نہ ہوں جن سے امریکہ کے معاشی و فوجی مفادات وابستہ ہیں۔

یروشلم کا مسئلہ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اسے یہودی، عیسائی اور مسلمان سبھی مقدس مانتے ہیں۔ 1948ء میں اسرائیل کے قیام کے وقت یہ دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ مشرقی یروشلم جہاں مسجد اقصی کے ساتھ یہودیوں اور عیسائیوں کی بھی قدیم عبادت گاہیں قائم ہیں عربوں کے قبضہ میں تھا لیکن 1967ء کی جنگ میں اسرائیل نے اس پر قبضہ کرلیا اور اسے اپنا دارالحکومت بنالیا۔ اگرچہ دنیا کے ممالک کی اکثریت نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے اور اقوام متحدہ نے بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے لیکن اسرائیل کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ کسی طرح امریکہ کو اس کے موقف کو تسلیم کرنے پر مجبور کردیا جائے۔ کانگریس میں ہمیشہ اسرائیلی موقف کو حمایت حاصل رہی مگر امریکی صدور نے ہر بار اس کی مخالفت کی۔ ویسے یروشلم کے بارے میں امریکی رائے ہمیشہ یہی رہی ہے کہ اسے اسرائیل کے حوالے کردیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 242 کو جس میں جنگ کے ذریعے فتح کئے گئے علاقے کو غیر قانونی کہا گیا ہے، ہمیشہ مشروط طور پر تسلیم کرتا رہا ہے۔ یعنی وہ اس قرارداد کو امن کی بنیاد بتانے کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ "بعض" علاقوں کو چھوڑ کر ہی یہ ممکن ہے۔ اس سے امریکہ کی مراد ہمیشہ یہی رہی ہے کہ یروشلم پر عرب اپنا دعوی ختم کرکے اسرائیل سے امن معاہدہ کرلیں۔

امریکی سیاست پر وہاں کے یہودی گروہوں کا قبضہ یا کنٹرول ایک عالم کو معلوم ہے۔ ایسا وہ اپنی اجتماعیت اور امریکی انتخابات میں مختلف امیدواروں کو پیسہ دے کر کرپاتے ہیں۔ عربوں کے پاس بھی اب پیسے کی کمی نہیں ہے لیکن ان کی صفوں میں اتحاد نہیں ہے۔ اس وقت امریکہ کی ہتھیار بنانے کی انڈسٹری سعودی عرب، کویت، متحدہ عرب امارات اور دوسرے خلیجی ملکوں کی وجہ سے چل رہی ہے۔ اگر یہ ممالک یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ اس وقت تک امریکی ہتھیار نہ خریدیں گے جب تک امریکہ اس بل کو کالعدم نہیں کردیتا تو واشنگٹن کو جھکنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نظر نہ آئے۔ مگر ایسا کوئی اقدام وہ لوگ کیسے کرسکتے ہیں جو اپنی بقا کے لئے واشنگٹن کے محتاج ہیں۔

یروشلم کی آخری حیثیت طے کرنے کے لئے پی ایل او اور اسرائیل کے درمیان مذاکرات بہت جلد ہونے والے ہیں لیکن ہوا کے رخ کا اندازہ کرکے اب یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں رہا کہ یاسر عرفات اپنی بقا کے لئے اس مقدس شہر کو بھی یہودیوں کے حوالے کرنے سے نہ ہچکچائیں گے لیکن کیا عالم اسلام بھی اسے قبول کرلے گا؟

•

یروشلم کو عیاشی کا اڈہ بناکر

مسجد اقصی کے تقدس کو پامال کرنے کی سازش

یروشلم آج کل کئی اعتبار سے خبروں میں ہے۔ ایک طرف اگر امریکی کانگریس نے زبردست اکثریت سے ایک بل پاس کرکے یروشلم کو اسرائیل کی راجدھانی تسلیم کرنے اور وہاں امریکی سفارتخانے کو منتقل کرنے کے لئے انتظامیہ کو 1999ء تک کی مہلت دی ہے تو دوسری طرف یوروپی یونین کے سابق و موجودہ صدور اور آئندہ ہونے والے صدر نے اورینٹ ہاؤس یا دارالشرق میں پی ایل او کے ایک لیڈر فیصل حسینی سے ملاقات کی ہے۔ اس ملاقات کی اسرائیل کی تمام ہی سیاسی پارٹیوں نے مذمت کی ہے۔ اسحاق رابن نے بھی اس کی زبردست تنقید کی ہے۔ یوروپی یونین کا تین نفری وفد وزیراعظم اسحاق رابن سے ملنے کے فوراً بعد دارالشرق گیا۔ غالباً اسی وجہ سے رابن کا ردعمل بھی کافی جارحانہ تھا۔ مگر یوروپی یونین کے وفد کے ارکان نے کہا کہ انہوں نے ماضی میں بھی ایسا کیا ہے اور آئندہ بھی ایسا کرتے رہیں گے۔ اسرائیل پی ایل او یا اس کے کسی بھی آفیسر کو یروشلم میں کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اس کے بقول یہ مقدس شہر اس کا ابدی دارالحکومت ہے۔ مگر پی ایل او اور عربوں اور بے شمار ممالک نے اسے کبھی تسلیم نہیں کیا ہے دارالشرق مدت دراز سے پی ایل او کے آفس کے طور پر کام کررہا ہے۔

سیاسی اعتبار سے خبروں میں رہنے والے یروشلم کا حال ہی میں ایک دوسری وجہ سے بھی کافی چرچا رہا۔ اس مقدس شہر میں ان یہودی نوجوانوں نے ابھی ایک کلچرل پروگرام کا انعقاد کیا تھا جو ہم جنسی کی لعنت میں مبتلا ہیں۔ ہم جنسوں کے علاوہ اس فسٹیول میں وہ نوجوان بھی تھے جو ہم جنسی کے بجائے صنف مخالف سے رشتہ رکھتے ہیں

دراصل اس مقصد کے لئے گذشتہ فروری میں ایک یہودی نے ایک کلب قائم کیا ہے جو ZionSquire کے پاس ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انتہاپسند یہودی اپنے جلسے جلوس کرتے رہتے ہیں۔ مگر صرف ایک بار ایسا ہوا کہ کلب جانے والوں اور مذہبی یہودیوں میں تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بالعموم یہاں سکون رہا ہے۔ لیکن حال ہی میں ایک یہودی تہوار کے موقع پر کلب کے ذمہ داروں نے ہم جنسی کا ہفتہ منانے کا پروگرام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تو ہنگامے کا پورا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ مذہبی یہودیوں نے دھمکی دی تھی کہ وہ یہ پروگرام نہ ہونے دیں گے۔ اس دھمکی

باقی صـ٦ پر

"میں نے مغربی ایشیا کے امن کی قلعی کھول دی"

کیا ایک ہزار فلسطینیوں کو ملک بدر کرنے کے قذافی کے قدم کو انسانی عمل کہا جاسکتا ہے

بے گھر فلسطینیوں کے لئے بھی یہ بات تکلیف دہ ہوگی کہ کسی مہمان ملک سے انہیں بے روزگار کرکے ملک بدر کردیا جائے۔ اگرچہ ملک بدری ان کے لئے نئی چیز نہیں ہے لیکن تھوڑا بہت آرام و آسائش کے بعد مصائب بہرحال تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ غالبا اسی احساس نے ان فلسطینیوں کو زیادہ ستایا ہوگا جو لیبیا اور مصر کی سرحدوں کے درمیان پھنسے ہوئے تھے۔ ان غریب الوطنوں کو کرنل قذافی نے ملک بدر کردیا تھا۔ یہ تمام لوگ پہلے تو قبرص گئے اور پھر زیادہ تر جن کے پاس شام کے سفری کاغذات تھے شامی حکومت کی مدد سے وہاں چلے گئے۔ لیکن ان میں سے بعض کی مشکلات ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔

دراصل بعض خاندانوں کے بچے لیبیا میں پیدا ہوئے اور ان کے شامی سفری کاغذات نہیں بن سکے۔ شام کے افسران نے انہیں ان کے بچوں کے بغیر ملک میں داخل ہونے کی اجازت دی جسے ان ماؤں نے رد کردیا۔ ایسے تقریبا تیس لوگ تھے اس لئے امید ہے کہ ان کا مسئلہ بھی بہت جلد حل ہوجائے گا۔

تقریبا 9 سو فلسطینی مصر و لیبیا سرحد کے قریب ایک قصبے مساد کے باہر کیمپوں میں کسمپرسی کی زندگی بسر کررہے تھے۔ یہ وہ فلسطینی تھے جنہیں قذافی نے اپنے ملک سے نکال دیا تھا۔ قذافی کا کہنا ہے کہ اپنے اس اقدام سے انہوں نے نام نہاد مغربی ایشیائی امن کی قلعی کھول دی ہے۔

اگر قذافی پی ایل او اسرائیل معاہدے کی خامیاں ظاہر کرنا چاہتے تھے تو وہ کسی اور طریقے سے بھی یہ کرسکتے تھے۔ فلسطینیوں کو بے گھر کرکے انہیں یہ احساس دلانا کہ وہ اب بھی بے وطن ہیں، کسی بھی پیمانے کے مطابق انسانی عمل نہیں قرار پاسکتا۔ دراصل قذافی ملک کی کمزور ہوتی ہوئی معیشت کے پیش نظر غیر ملکی لوگوں کو اپنے ملک سے نکال رہے ہیں تاکہ لیبیا کے شہریوں کو روزگار مل سکے اور اس طرح وہ مظاہروں اور احتجاج سے باز رہیں۔ اسی پالیسی کے تحت اب تک چھ ہزار فلسطینی، سات ہزار مصری اور ان سے بھی کہیں زیادہ سوڈانی نکالے جاچکے ہیں۔

نکالے گئے مصری اور سوڈانی تو اپنے ملک واپس ہوگئے۔ 6 ہزار میں سے اکثر فلسطینی بھی لبنان یا کہیں اور چلے گئے کیونکہ ان کے پاس سفر کے لئے قانونی کاغذات تھے۔ مساد میں پھنسے ہوئے 9 سو فلسطینی وہ تھے جن کے پاس سفری کاغذات نہیں تھے۔ لیکن ان کے پاس یہ ثبوت تھے کہ وہ شام سے لیبیا گئے تھے۔ اس لئے شام انہیں اپنے یہاں لاکر بسانے پر راضی ہوگیا۔

ادھر قذافی نے ایک نیا شوشہ چھوڑا ہے۔ ایک پریس کانفرنس میں انہوں نے دھمکی دی کہ مصر، سوڈان، نائجیریا، چاڈ، تیونیسیا اور الجزائر کے ان پانچ لاکھ شہریوں کو ملک بدر کردیا جائے گا جو وہاں کام کررہے ہیں۔ اس ضمن میں قذافی نے اقوام متحدہ سے فضائی پابندی اٹھانے کی درخواست کی تاکہ انہیں ان کے وطن بھیجا جاسکے۔ مگر اقوام متحدہ نے اسے رد کردیا۔ اس کے بعد قذافی نے امریکہ اور اقوام متحدہ پر زبردست تنقید کرتے ہوئے کہا کہ وہ سیکورٹی کونسل کو تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ یہ امریکہ کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔

قذافی کا یہ نیا اقدام دراصل ملک پر ان کی کمزور پڑتی ہوئی گرفت کا نتیجہ ہے۔ ملک کے خلاف ہوائی پابندی اور دوسری پابندیوں کی وجہ سے ملکی معیشت کافی خراب ہوچکی ہے۔ ہزاروں لیبیائی باشندے بے روزگار ہوگئے ہیں۔ ضرورت کی بہت ساری اشیاء بازاروں میں دستیاب نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ اپریل میں بنغازی میں احتجاج شروع ہوگیا تھا۔ ان مظاہرین کی قیادت بقول مغربی پریس کے "بنیاد پرست" عناصر کر رہے تھے۔ یہ مظاہرین ستمبر میں پھر سڑکوں پر نکل آئے اور توڑ پھوڑ بھی کی جس سے 30 مظاہرین و پولیس والے ہلاک ہوگئے۔

قذافی مخالفین ذرائع کے مطابق اس وقت انہیں اپنے اقتدار کے لئے زبردست خطرہ ہے۔ افغانستان کے جہاد میں حصہ لے کر واپس لوٹنے والے مجاہدین چھوٹے پیمانے پر بغاوت شروع کرچکے ہیں۔ انہیں عوام کی تائید حاصل ہے۔ ان میں سے بعض فوج سے بھی رابطہ بنائے ہوئے ہیں اور کتنے ہی ان مقامات سے جہاں فوجی ساز و سامان ہے، ہتھیار اور بارود کی چوری کررہے ہیں۔ اپنے خلاف بڑھتی ہوئی مخالفانہ سرگرمیوں سے قذافی نے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ نوجوانوں میں بے روزگاری اس کا اصل سبب ہے۔ چنانچہ انہوں نے غیر ملکی کام کرنے والوں کو نکالنا شروع کردیا تاکہ لیبیا کے اصل باشندوں کو نوکریاں مل سکیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ پہلے کی بہ نسبت اسلامی گروپ اب زیادہ منظم ہے اور قذافی کے لئے مسئلہ پیدا کرسکتا ہے۔ اسلام پسندوں کی مقبولیت نے بھی قذافی کو یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ ●

بقیہ: مسجد اقصیٰ

کے پیش نظر کافی تعداد میں وہاں پولیس موجود تھی۔ لیکن مذہبی جنونی یہودی وہاں پہنچے ہی نہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم جنسی کے علمبردار یہودیوں نے کہا کہ یہاں وہ اس لئے نہیں آئے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ شہر کے بیچ وہ جنگ ہار جاتے اور پٹ کر جاتے۔

یروشلم کے روسی اسکوائر کی حالت اور بھی خراب ہے۔ یہاں تو سبت کے دن بھی شراب خانے اور کلب کھلے رہتے ہیں جہاں ہر قسم کی موسیقی اور رقص و سرود کی محفلیں جمی رہتی ہیں۔ ایک بار یہاں کے ایک ریستوران کو رات میں جلا دیا گیا تھا اور پولیس کو شبہ ہے کہ یہ مذہبی انتہا پسندوں کا کارنامہ ہے۔ دوسرے دن شام کو بے شمار افراد نے جلے ہوئے ریستوران کے پاس جمع ہوکر سیکس اور مغربی کلچر سے اپنی یک جہتی کا ثبوت فراہم کیا۔

مغربی یروشلم میں سیکس اور موسیقی سے بھرپور زندگی رات بھر جاری رہتی ہے لیکن عرب یا مشرقی یروشلم میں یہ جلد بند ہوجاتی ہے۔ سیکس کی تجارت سیاسی و مذہبی تنازعات اور تقسیموں کو اکثر پس پشت ڈال دیتی ہے۔

اسرائیلی اخبارات ایسے ٹیلی فون نمبر شائع کرتے ہیں جنہیں ڈائل کرکے آپ اپنی پسند کی لڑکی گھر بلا سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے آپ کو 80 سے 250 ڈالر تک ایک رات کے لئے ادا کرنا ہوگا۔ ان نمبروں کو آپ ڈائل کریں تو کچھ اس طرح کی آواز آئے گی۔ "آپ کس قومیت کی لڑکی چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس عیسائی لڑکیاں ہیں۔ روسی ہیں، رومانوی ہیں۔ سنہرے بالوں والی اور کالے بالوں والی، لمبی چاہیے یا چھوٹے قد کی وغیرہ وغیرہ۔" یہ لڑکیاں تو امیرزادوں کے لئے نہیں۔ کم آمدنی والے لوگوں کے لئے ہیں۔ مساج پارلر کھلے ہوئے ہیں جہاں یہ بزنس تیزی سے ہورہا ہے۔ یہ بزنس روسی مافیا کے قبضہ میں ہے۔ ایک اندازے کے مطابق روس اور یوکرین سے یہاں تین ہزار سے زائد طوائفیں آئی ہوئی ہیں۔ اسرائیلی یہودی لڑکیاں بھی اس بزنس میں تیزی سے داخل ہورہی ہیں، لطف اندوزی کے لئے بھی اور پیسہ کمانے کے لئے بھی۔ ●

بقیہ: مسلمانوں کو بیوقوف بناؤ مہم

بالواسطہ طور پر انہوں نے اردو کو ہندی بنانے کی اپیل کی۔ لیکن کیا کبھی انہوں نے ہندی یا سنسکرت کے رسم الخط کو بھی بدلنے کی بات کہی۔ کیا اردو کو لوگ تبھی لکھ پڑھ سکتے ہیں جب اس کا رسم الخط بدل دیا جائے۔ انگریزی یا کسی اور زبان کا رسم الخط بدلنے کی ضرورت کیوں پیش نہیں آتی۔ کیا اردو کا رسم الخط اتنا گنجلک ہے کہ اسے لکھا پڑھا نہیں جاسکتا؟۔ دراصل مسٹر چوان بریلی میں مسلمانوں کو بے وقوف بنانے گئے تھے اور اسی لئے انہوں نے اردو کی تعریف شروع کردی لیکن ان کے دل کا چور بول پڑا اور وہ اپنی اصل حیثیت پر آگئے۔

انتخابات قریب آنے کے ساتھ ساتھ کانگریسی لیڈروں کی سرگرمیوں میں ابھی مزید اضافہ ہوگا اور ہر مسلم علاقہ میں کنونشن، کانفرنس اور میٹنگ منعقد کرواکر انہیں بے وقوف بنانے کی کوششیں کی جائیں گی۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سیاستدانوں کی چالوں میں نہ آئیں اور اب تو بے وقوف بننا چھوڑ دیں۔ اور انہیں اپنے آپ سے ایک سوال بھی کرنا چاہیے کہ کیا ریزرویشن مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی اور ترقی و خوشحالی کی کلید ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمان اپنی محنت سے ترقی کرسکتے ہیں بھیک میں ملے ہوئے ٹکڑوں سے نہیں۔

بقیہ: بھگوان گڈوانی

موکش (نجات) جیسے تصورات کا وہ احترام کرتے تھے۔ تاہم آخری اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ آریہ باہر جانے کے بعد بھارت ورش میں واپس کیوں آئے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے وہاں انہیں زیادہ مصائب، بدعنوانی، توہم، مزاجیت کا سامنا کرنا پڑا۔

بات یہ ہے کہ افسانہ طراز گڈوانی ایک فرقے کو اس کے ماضی سے کٹ جانے کی دہائی دے کر افسانوی باتوں کو علمی اور تاریخی تحقیق کے برابر لاکھڑا کرنے کی ناکام کوشش کررہے ہیں۔ ناول تو بہت سے لوگوں نے لکھے ہیں ان میں سے گڈوانی بھی ہیں لیکن ان کے ساتھ نفسیاتی مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس سے بہت دوررس اپنے حق میں حد درجہ مفید نتائج کی توقع وابستہ کرلیتے ہیں۔ ٹیپو سلطان سے لے کر آریوں کی واپسی اسی آرزو مندی کا اظہار ہے۔

مطالباتی و معاہداتی سیاست سے مسلمانوں کو کچھ نہیں ملے گا

مسلمان اپنے ووٹ کی طاقت کا استعمال اقتدار میں حصہ دار بننے کے لیے کریں

محفوظ الرحمن

آزاد ہندوستان میں ہر چناؤ سے پہلے یہ سوال کہ مسلمان کیا کریں صرف اس لئے اٹھتا رہا ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو اس مقام پر لاکھڑا کرنے کی کوشش نہیں کی جو ان کا اصل مقام تھا۔ وہ یہ بھول گئے کہ وہ شریک سلطنت بھی ہیں اور ان کا ووٹ بھی اتنا ہی قیمتی ہے جتنا کہ دوسروں کا۔ انہوں نے کبھی بھی یہ دیکھنے اور سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ وہ اپنے ووٹ کو صحیح ڈھنگ سے اپنے لئے استعمال کرکے اقتدار میں حصہ دار بن سکتے ہیں۔ وہ اقتدار کی پالکی میں اپنے لئے جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے اس کے کہار بن گئے۔ ان کے لیڈروں نے انہیں سمجھایا کہ انہیں اقتدار میں حصہ حاصل کرنے کے بجائے ایک وسیع اور مضبوط سائبان چاہئے جو انہیں مصائب و مسائل کی دھوپ اور بارش سے قرار واقعی تحفظ فراہم کرسکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ مسلم قیادت شروع سے ہی مسلمانوں کو یہ باور کراتی رہی ہے کہ رزم گاہ حیات میں وہ بیساکھیوں کے سہارے ہی اتر سکتے ہیں اور قابل بھروسہ بیساکھیوں کی تلاش کو ہی ہمیشہ سیاسی تدبر کی معراج قرار دیا جاتا ہے۔

اسی سوچ کی کوکھ سے مطالباتی اور معاہداتی سیاست کے اس تباہ کن نظریے نے جنم لیا جسے مسلمان آج بھی حرز جاں بنائے ہوئے ہیں اور اسی مطالباتی اور معاہداتی سیاست کے تصور کے نتیجے میں ہر چناؤ سے پہلے یہ سوال جان بوجھ کر اٹھایا جاتا ہے کہ مسلمان کسے ووٹ دیں۔ اور کسے اپنا مربی اور اپنا محافظ قرار دیں۔ یہ سوال وہ لوگ اٹھاتے ہیں اور اس سوال کو وہ لوگ ابھارتے اور اچھالتے ہیں جن کے ہاتھوں میں مطالبات کے کشکول ہوتے ہیں اور جو انفرادی اور اجتماعی طور پر سیاسی

پارٹیوں سے سودے کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ووٹوں کے سودے ان کے مسائل و مصائب کے سودے اور اس سے بھی بڑھ کر اپنی اس اہلیت کے سودے کہ وہ مسلمان کہی جانے والی بھیڑ کو ہانک کران کے باڑے میں پہنچا سکتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ کس پارٹی کو ووٹ دیں۔ ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر یہ اہلیت پیدا کریں کہ جس پارٹی یا جن پارٹیوں کو انہوں نے ووٹ دے کر ایوان اقتدار تک پہنچایا ہے ان سے وہ اپنی بات منوا سکیں جن مطالبات کی بنیاد پر انہیں ووٹ دیا ہے ان پر عمل نہ کرنے کی صورت میں وہ ان پارٹیوں کو اور ان کے لیڈروں کو سزا دے سکیں۔ مسلمان اپنے اندر یہ صلاحیت یا یہ اہلیت اب تک پیدا نہیں کرسکے ہیں اس لئے وہ مختلف پارٹیوں کو آزماتے ہیں اور جب ان کی پالکی کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر وہ ایوان اقتدار کی دہلیز تک پہنچا دیتے ہیں تو اس کے بعد ان کی بیوفائی اور ان کی وعدہ شکنی کا ماتم شروع کردیتے ہیں۔ پہلے وہ کانگریس کو ووٹ دیتے رہے اور اس کی جیرہ دستیوں کا ماتم کرتے رہے۔ پھر انہوں نے ایس
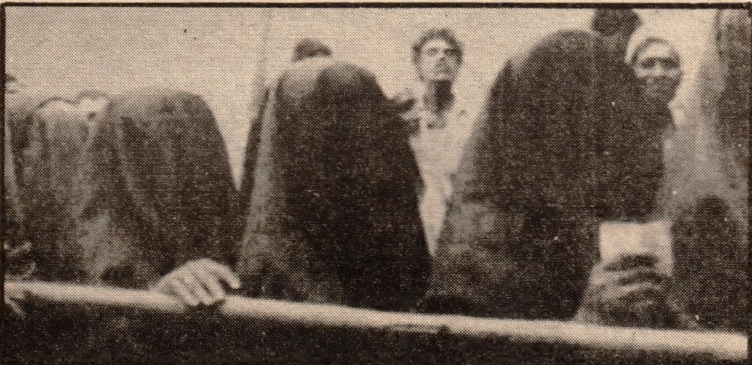
وی پی حکومتیں بنانے میں مدد دی اور اس بات کا شکوہ کرتے رہے کہ انہیں اور ان کے مسائل کو نظرانداز کردیا گیا۔ پھر جنتا پارٹی، جنتا دل اور سماجوادی پارٹی جیسی سیکولر پارٹیوں کے ساتھ مسلمانوں نے اپنی قسمت وابستہ کی اور پھر کسی نہ کسی درجے میں ان کے ہاتھ مایوسی ہی آئی۔ وہ وہیں کھڑے رہے جہاں پہلے تھے، ایوان اقتدار کے دروازے ان پر پہلے ہی کی طرح بند رہے وہ اگر پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں پہنچے بھی تو ان کی حیثیت ذیلی رہی۔ انہیں وزارتی منصب ملے تو بھی یہ احساس ہمیشہ دامن گیر رہا کہ انہیں جو کچھ ملا ہے ان کے حق کے طور پر نہیں بلکہ کسی وزیر اعلی یا وزیر اعظم کی نگہ کرم کا نتیجہ ہے۔

آزادی کے بعد سے ہی مسلمانوں پر اقتدار میں شرکت کے دروازے بند کرنے کے لئے جو سب سے کامیاب چال چلی گئی وہ یہی تھی کہ انہیں ان کے لیڈروں کے ذریعے یہ باور کرا دیا گیا کہ اکثریتی فرقے کی کچھ پارٹیاں یا کچھ بہت ہی طاقتور عناصر ان کے دشمن ہیں۔ یہی لوگ فسادات کراتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ مسلمان اس ملک میں پھلیں پھولیں، چنانچہ ان کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ ان عناصر سے انہیں ہر صورت اور ہر قیمت بچائے رکھا جائے۔ پہلے انہیں تحفظ فراہم کرنے کی ذمہ داری کانگریس نے سنبھال رکھی تھی پھر جب اس کا اصل چہرہ سامنے آگیا تو یہ ذمہ داری کچھ ان دوسری پارٹیوں نے سنبھال لی جو اپنے آپ کو سیکولر اور جمہوریت پسند کہتی ہیں۔ مسلمانوں کو خوف کی نفسیات میں مبتلا رکھنے میں پہلے کانگریس کا فائدہ تھا اور خوف کی اس نفسیات کا فائدہ اب اپنے آپ کو سیکولر اور جمہوریت پسند کہنے والی پارٹیاں اٹھا رہی ہیں اور خوف کی اسی نفسیات کو ابھار کر مسلمانوں سے گذشتہ کئی برسوں سے یہ کہا جارہا ہے کہ تم اجتماعی وزن کو ان پارٹیوں کے پلڑے میں ڈال دو جو بی جے پی جیسی فرقہ پرست پارٹیوں کی راہ روک سکتی ہوں۔ مسلمانوں کے جتنے چھوٹے بڑے لیڈر اور جتنی چھوٹی بڑی پارٹیاں ہیں آج یہی راگ الاپتی سنائی دے رہی ہیں، سب ایک سر میں یہی کہتی سنائی دے رہی ہیں کہ مسلمان اپنے سیاسی طرز عمل کی بنیاد بی جے پی اور دوسرے فرقہ پرست پارٹیوں کی پرزور مخالفت کو ہی بنائیں۔ اس سوچ کو پروان چڑھانے میں سبھی ہمہ تن مصروف ہیں اور ان کے لئے اس کے فائدے بھی بہت ہیں، وہ اس کے سہارے جنتا دل، سماجوادی پارٹی اور دونوں کمیونسٹ پارٹیوں کے ساتھ ساتھ کانگریس کے لئے بھی ان دروازوں کو بھی کھول سکتے ہیں جنہیں مسلمانوں نے سختی کے ساتھ بند کر رکھا ہے۔۔ اس اصول کو مان لینے کے بعد کہ مسلمانوں کا

باقی صفحہ 16 پر

سابقہ سیاسی رویہ کا احتساب

وقت آگیا ہے کہ امت مسلمہ اپنے سابقہ سیاسی رویے کا ناقدانہ جائزہ لے اور یہ دیکھے کہ اب تک مختلف سیکولر پارٹیوں کا ووٹ بینک بن کر اس نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ یہ بات آپ کو خوب معلوم ہے کہ کوئی بھی غیر مسلم سیاسی پارٹی آپ کے لئے مخلص نہیں ہے پھر آخر کب تک آپ کسی دشمن کو سیاسی مجبوری کے تحت ووٹ دیتے رہیں گے؟ آخر کب تک قاتل کے بازو کو مزید قوت فراہم کرنا ہماری زندگی کے لئے ناگزیر سمجھا جاتا رہے گا؟ آخر کب تک بیس کروڑ افراد پر مشتمل ایک امت سیاسی طور پر غلام بنائی رکھی جائے گی؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی ایسے رویے کی تشکیل ممکن نہیں جو بیس کروڑ مسلمانوں کی عظیم الشان عددی قوت کو عظمت کی طرف لے جاتی ہو؟ ملی پارلیامنٹ میں آپ کے بھائی بہن اس سوال کے جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ ان کے پاس ایک نئے خوشگوار مستقبل کا صرف خواب ہی نہیں، ایک موثر لائحہ عمل بھی ہے جو کتاب و سنت کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہے ان کا کہنا ہے کہ اگر بالفرض محال کسی نئے سیاسی رویے کی تشکیل موجودہ صورت حال میں ممکن نہیں ہے تو آخر مروجہ سیاسی رویے کو برقرار رکھنے کی ضرورت بھی کب ہے۔ کیوں نہ اس سیاسی رویے کا مکمل خاتمہ کردیا جائے جس پر چل کر امت مسلسل زندگی سے دور اور موت سے قریب ہوتی جارہی ہے۔

ملی پارلیامنٹ دراصل ایک نئے سیاسی رویے کی تشکیل کے لئے کوشاں ہے۔ گذشتہ سال اس کے پہلے اجلاس منعقدہ دہلی میں ہم نے یہ عہد کیا تھا کہ ہم امت مسلمہ کو سیاسی بھول بھلیوں سے نکال کر ایک نئے انقلابی راستے پر گامزن کریں گے۔ ہم برسہا برس سے اس مسئلے پر خود بھی غور کرتے رہے ہیں اور دوسرے دردمندان ملت کو بھی اس امر پر سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ الحمد للہ ہماری یہ دعوت اب اجنبی نہیں رہی ملک کے گوشے گوشے میں آپ کے بھائی بہن ایک نئے راستے کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

الحمد للہ گذشتہ مہینوں میں سیاسی امور کی کمیٹی نے بڑے پیمانے پر مشوروں کی روشنی میں سیاسی بل کا ایک مسودہ تیار کرلیا ہے جسے اب بحث کے لئے عنقریب ملی پارلیامنٹ کے پٹنہ اجلاس میں پیش کیا جانے والا ہے۔ مذکورہ بل دراصل اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ اس ملک میں امت کو ابھی اس کا سیاسی حق ملنا باقی ہے ذرا غور کیجئے! اٹھاسی کروڑ آبادی والے اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق کوئی بیس کروڑ ہے۔ اب اگر متناسب نمائندگی کا فارمولا بھی اختیار کیا جائے تو 554

> **بھلا جس امت کو مختلف سیاسی پارٹیوں میں بٹنے کے بعد بھی اس کی تعداد کے مطابق نمائندگی نہ مل سکے تو اس کے سیاسی حقوق کی بات کیسے سوچی جاسکتی ہے۔**

نشستوں کی پارلیامنٹ میں مسلمانوں کو 119 نشستیں ملنی چاہئے تھیں جب کہ اب تک پارلیامنٹ کے اندر مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد 48 رہی ہے یہ بھی ایک استثنائی تعداد ہے جو 1977ء کے الیکشن میں دیکھنے کو آئی۔ اب بھلا جس امت کو مختلف سیاسی پارٹیوں میں بٹنے کے بعد بھی اس کی تعداد کے مطابق نمائندگی نہ مل سکے تو اس کے سیاسی حقوق کی بات کیسے سوچی جاسکتی ہے۔ جو نظام نیچے سے اوپر تک دجل و فریب پر قائم ہو، جہاں دانستہ طور پر مسلمانوں کی عددی قوت کو کم کرکے دکھایا جاتا ہو، جہاں سیاسی حلقوں کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہو کہ مسلم ووٹ بے اثر ہوجائیں، جہاں مسلمانوں کو سیاسی غلام بنائے جانے کی ہر ڈھکی چھپی ترکیب پر نہایت عیاری سے عمل ہورہا ہو، بھلا اس نظام میں مسلمانوں کا کوئی سیاسی مستقبل کیونکر ہوسکتا ہے؟ آئین نظام کے سارے سیاسی ضابطوں کو جوں کا توں قبول کرلینے اور اس میں اپنے آپ کو فٹ کرتے رہنے کی مسلسل کوشش کا واضح مطلب یہ ہے کہ رہتی دنیا تک امت کو اس کا جائز سیاسی حق ملنا تو کجا اس پر مسلسل گہراتے ہوئے سیاسی غلامی کے سائے سے نجات بھی ممکن نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مروجہ سیاسی نظام کو نئے سرے سے ترتیب دیا جائے۔ انتخاب کے طریقوں میں وہ بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں جو ملک میں ہر چھوٹی بڑی مذہبی اکائی اور تہذیبی گروہ کو اس کا جائز سیاسی حق دلا سکیں۔ سماجی انصاف کے قیام کی راہ میں جو بھی رکاوٹ ہو خواہ وہ بظاہر کتنی ہی مضبوط کیوں نہ نظر آتی ہو اسے دور کیا جائے اور ظلم و جبر پر قائم اس نظام کو سیاسی انصاف کے راستے پر گامزن کردیا جائے کہ اس کے بغیر سماجی انصاف، کا قیام ممکن نہیں۔

ملی پارلیامنٹ کا پٹنہ اجلاس اس اعتبار سے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوگا کہ اس اجلاس میں سیاسی غلامی کو خیرباد کہہ کر ایک نئے انقلابی سیاسی رویے کی بناء ڈالی جائے گی۔ یہ باشندگان پٹنہ کی خوش بختی ہے کہ ایک ایسا تاریخ ساز اجلاس ان کے شہر میں منعقد ہورہا ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر میں ایک اہم رول ادا کرے گا۔

یاد رکھئے! موجودہ ایام ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں ایک نازک عبوری مرحلہ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جب برہمن سامراج کی فتنہ سامانیوں سے تنگ آکر امت ایک نئے سیاسی لائحہ عمل کی تلاش میں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ برہمنوں کے ذریعہ استحصال کے بعد اب دلت اور شودروں کے ذریعہ اس کا استحصال شروع ہوجائے۔ لاقدر اللہ! (ملی پارلیامنٹ کے مجوزہ سیاسی بل سے ایک اقتباس)

اسلامی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرنے والوں کی گرفتاری — یا

بے نظیر کی امریکہ کی نظروں میں سرخرو ہونے کی تڑپ

کیا اسلامی انقلاب کی کوشش کے پیچھے تبلیغی جماعت کا ہاتھ تھا

گذشتہ ڈیڑھ دو ہفتے سے پاکستانی اخبارات کی سرخیوں کا موضوع بننے والی وہ خبر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حال ہی میں ہمارے ملک کی مسلح افواج کے چند حاضر سروس اعلیٰ و درمیانے درجے کے افسروں نے مل کر ایک فوجی انقلاب کا منصوبہ تیار کیا۔ اس کا بروقت پتہ چل جانے کی وجہ سے اسے فوری طور پر ناکام بنا دیا گیا اور سرغنہ افراد کو گرفتار کرلیا گیا جن میں ایک میجر جنرل کی سطح کا فوجی افسر بھی شامل ہے۔

اس خبر کا پبلک سطح پر سب سے پہلے انکشاف سینیٹر طارق چودھری نے ایک پریس کانفرنس میں کیا اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ملک کے ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے فوجی افسروں اور جوانوں میں تشویش پائی جاتی ہے۔ کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ پھر جب یہ ایک باخبر اور خصوصی تعلقات کی شہرت رکھنے والے سیاستدان کے ہونٹوں سے نکل کر پریس کے کوٹھوں چڑھی تو ایک خصوصی نشست میں ایڈیٹروں کے سوالات کے جواب دیتے ہوئے وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے کہا کہ کچھ فوجی افسر گرفتار کئے گئے ہیں ان کے فعل و عمل کے بارے میں تفتیش ابھی جاری ہے۔ جس روز وزیراعظم کا یہ انکشاف یا طارق چودھری کے انکشاف کی تصدیق اخبارات میں شائع ہوئی اسی روز (پندرہ اکتوبر) ایک بڑے اخباری گروپ کے اردو اور انگریزی روزناموں نے صفحہ اول پر یہ خبر بھی شائع کی کہ چھتیس گرفتار شدگان میں سے اعلیٰ عہدے کے حامل جی ایچ کیو میں ڈائرکٹر جنرل انفنٹری کے عہدے پر فائز میجر جنرل ظہیر الاسلام عباسی ہیں۔ ان کے بارے میں مزید بتایا گیا ہے کہ موصوف برگیڈیئر کی حیثیت سے نئی دہلی میں پاکستان کے ہائی کمیشن میں ملٹری اتاشی کے فرائض بھی سرانجام دے چکے ہیں۔ خبر کے مطابق " جنرل عباسی نے بحیثیت بریگیڈیئر بھارت میں اپنی تعیناتی کے دوران بھارتی فوج کے مشہور زمانہ مشقوں کے منصوبے کی آڑ میں سندھ پر حملے کی سازش کا سراغ لگایا تھا اور بعض اہم دستاویزات پاکستان پہنچائیں جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان نے موثر دفاعی حکمت عملی اختیار کی۔ جنرل عباسی کو نئی دہلی میں بھارتی ایجنسی "را" نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور انہیں زخمی حالت میں ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر بھارت سے نکل جانے کا حکم بھی دیا تھا۔ جس پر وہ پاکستان واپس آ گئے۔" خبر کے آغاز میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ "ان افسروں پر الزام ہے کہ وہ بنیاد پرستوں کے حامی ہیں اور ملک میں مسلح انقلاب لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" خبر کے آخری حصے میں کہا گیا ہے کہ "گرفتار ہونے والے افسروں کی اکثریت صوم و صلوٰۃ کی پابند خیال کی جاتی ہے جب کہ ان میں سے بعض تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں میں بھی شریک رہے ہیں۔" معلوم ہوا ہے کہ ان فوجی افسران پر الزام ہے کہ وہ بعض مذہبی عناصر کے ساتھ مل کر ملک میں اسلامی انقلاب لانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ انٹلی جنس بیورو اور ملٹری انٹلی جنس نے مل کر ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ ان افسران کے علاوہ بعض دینی اور سیاسی جماعتوں کے سرگرم کارکن بھی گرفتار کئے گئے ہیں۔ جن سے آئی بی پوچھ گچھ کر رہی ہے۔" (نوائے وقت لاہور، مورخہ 14 اکتوبر)

یہ پہلی خبر تھی جس میں چندے تفصیل کے ساتھ فوجی انقلاب لانے والوں کے فوجی مراتب ان کے پس منظر اور افکار و خیالات کے بارے میں کچھ بتایا گیا۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اس کے سرغنہ افراد کی حب الوطنی ایک مصدقہ امر ہے۔ گروہ کے مرکزی کردار میجر جنرل ظہیر الاسلام عباسی نے بھارت میں اپنی تعیناتی کے دوران دشمن کی پاکستان کے خلاف مہلک منصوبہ بندی کا پتہ چلانے اور اس سے اپنی حکومت کو بروقت آگاہ کرنے کے لئے اہم خدمت سرانجام دی تھی۔ دوسری اہم بات جو سامنے آئی وہ ان کا باعمل مسلمان ہونا اور ایک قطعی غیر سیاسی ڈھیلی ڈھالی مذہبی تنظیم تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستگی ہے۔ تبلیغی جماعت سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھتی ہے۔ جبکہ زیر بحث میں بتایا گیا ہے کہ "ان افسران پر الزام ہے کہ وہ بعض مذہبی عناصر کے ساتھ مل کر ملک میں اسلامی انقلاب لانے کی تیاری کر رہے تھے۔"

ایک قدرے تفصیلی خبر موجودہ بغاوت کے بارے میں لاہور، اسلام آباد اور کراچی سے شائع ہونے والے انگریزی کے ایک معروف روزنامے کی اشاعت مورخہ 16 اکتوبر میں شائع ہوئی ہے۔ اس خبر میں کہا گیا ہے کہ:

(1) بغاوت کی اصل منصوبہ بندی کرنے والے بریگیڈیئر رینک کے فوجی افسر ہیں جن کا نام مستنصر باللہ ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ ان صاحب کا ماضی مشکوک ہے۔ (کن معنوں میں مشکوک، اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر مشکوک تھا تو وہ اب تک فوج میں اعلیٰ سطح پر نوکری کیسے کر رہے تھے)۔

(2) ان کے ذہن میں اس خیال نے پرورش پائی کہ ملک کے حالات کی اصلاح صرف ایک اسلامی انقلاب کے نتیجے میں کی جاسکتی ہے۔ اس کے لئے کشمیر کو آزاد کرانا بھی ضروری ہے۔ یہ سب کچھ فوجی مداخلت کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(3) انہوں نے کچھ حاضر فوجی افسروں کو بھی اپنے خیالات سے متفق کرلیا۔ وہ ان کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ ان میں سے بنیادی کردار میجر جنرل ظہیر الاسلام کو ادا کرنا تھا جنہیں منصوبے میں فوجی ہیڈ کوارٹرز پر قبضہ کرنے کی ذمہ داری تفویض کی گئی۔

(4) منصوبہ سازوں نے عالمی سطح پر جہاد کرنے والی دو اہم تنظیموں حرکۃ الانصار اور حزب المجاہدین کے ساتھ بھی روابط استوار کئے۔ یہ حرکت الانصار کا ایک کارکن ہے جس نے دو ہفتے قبل مظفر آباد میں اپنی گرفتاری کے بعد اس سازش کا حکام کے سامنے انکشاف کیا۔

(5) سازش کے سرغنہ بریگیڈیئر مستنصر باللہ نے حماقت یہ کی کہ وہ بغاوت کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری اسلحہ حاصل کرنے کی خاطر ایک کرنل کو ساتھ لے کر قبائلی علاقے میں چلے گئے۔ وہاں سے اپنی جھنڈے والی فوجی گاڑی پر اسلحہ لاد کر واپس آرہے تھے کہ اٹک کی چیک پوسٹ پر پیشگی اطلاع کی بناء پر دھر لئے گئے۔ یوں سازش بے نقاب ہوگئی اور اس کا سرغنہ پکڑا گیا۔

(6) یہ پہلا موقع نہیں کہ ایسی کوئی سازش پکڑی گئی ہے۔ آرمی چیف بننے کے چند ماہ بعد یعنی مئی 1993ء میں جنرل عبدالوحید نے اس وقت کے آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹننٹ جنرل جاوید ناصر کو بھی اسی لئے برطرف کیا تھا کہ وہ دنیا بھر کے ایک درجن مقامات پر اسلامی جہاد برپا کرنے والوں کو خفیہ طور پر اسلحہ فراہم کر رہے تھے۔

(7) جنرل جاوید ناصر اب بھی تبلیغ کے نام پر دنیا کے سفر پر رہتے ہیں۔ ان کے دور کے ان کے بعض ہم خیال ماتحت افسران کو اگرچہ آئی

> اس کے مقاصد نظریاتی بھی ہیں اور سیاسی بھی۔ نظریاتی ان معنوں میں کہ امریکی حکومت کو باور کرایا جائے کہ پاکستان کے اندر احیائے اسلام کی قوتیں اس حد تک سرگرم عمل ہیں کہ کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا ہے لہٰذا امریکہ کو اپنے نظریاتی مقاصد کے پیش نظر موجودہ لبرل پاکستانی حکومت کی پشت پناہی میں کوئی کمی نہیں آنے دینی چاہیے۔

ایس آئی سے تبدیل کرکے دوسری ذمہ داریاں تفویض کردی گئی تھیں لیکن انہوں نے اپنے سابقہ باس کے ساتھ تعلقات قائم رکھے۔ انہیں میں کچھ نے موجودہ بغاوت کی منصوبہ بندی میں بھی حصہ لیا ہے۔ (دی نیوز، لاہور مورخہ 16 اکتوبر)

اس پوری خبر میں دو باتیں آپ کو بہت نمایاں نظر آئیں گی۔ پہلی بات جو بظاہر ناقابل یقین ہے وہ یہ کہ ایک حاضر سروس میجر جنرل جو جی ایچ کیو میں ڈائرکٹر جنرل انفنٹری کے عہدے پر فائز ہے اور جو اتنا تجربہ کار ہے کہ دہلی میں اپنی ڈیوٹی کے دوران پاکستان کی سلامتی کے خلاف بھارتی حکومت کے فوجی منصوبوں کو بھانپ لیتا ہے اور ان سے متعلق دستاویزات بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے، ملک کے اندر بغاوت کے ایسے منصوبے کا مرکزی کردار ادا کرنے کے لئے کیسے تیار ہوسکتا ہے جسے بروئے کار لانے کے لئے ضروری اسلحہ قبائلی علاقے سے صرف ایک کار میں بھر کر لایا جانے والا ہو۔ جبکہ مقابلہ اس کا ایسے جی ایچ کیو اور ایسی کور سے ہو جس کی دسترس میں کہیں اعلیٰ درجے کا، کہیں جدید ترین، کہیں بڑی مقدار میں اسلحے کے کئی ڈپو ہوں۔ پھر مقابلہ بھی ان باغیوں کا اپنی فوج کے کئی ڈویژنوں پر مشتمل افرادی طاقت سے ہو ایسی طاقت جس کے سپاہیوں اور افسران کی بھاری اکثریت کے بارے میں یہ بات معلوم و معروف ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ تر قیادت کے خلاف بغاوت برداشت نہیں کرسکتے۔ اصل حقیقت تو اس ضمن میں مکمل تحقیقات کے بعد سامنے آئے گی۔ لیکن مندرجہ بالا خبر میں اسے جس طرح پیش کیا گیا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بغاوت کے بارے میں حقائق شاید کچھ مختلف ہیں۔ جنہیں نہ جانے کیوں اس خبر میں چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسری قابل توجہ بات اس خبر کی یہ ہے کہ اس میں بغاوت کو ایک خاص سیاسی رنگ دینے کی باقاعدہ سعی کی گئی ہے۔ اس کے ڈانڈے قائد حزب اختلاف میاں نواز شریف کے دور کے آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹننٹ جنرل (ر) جنرل جاوید ناصر کی ذات اور ان کی مذہبی سرگرمیوں سے جاکر ملائے گئے ہیں۔ جنرل جاوید ناصر جب آئی ایس آئی کے سربراہ تھے تو امریکہ کو ان کی اس حیثیت پر سخت اعتراض تھا۔ امریکی حکومت کے ذمہ داران کا خیال تھا کہ جنرل موصوف اپنے مذہبی و دینی خیالات کی وجہ سے کشمیر میں جہاد کی کامیابی کے بارے میں بڑے پرجوش ہیں۔ جنرل جاوید ناصر کی نواز شریف کے ساتھ وفاداری بھی معلوم و معروف تھی۔ اسی لئے ان کے دور میں امریکہ نے پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دینے کی دھمکی دی تھی۔ نواز شریف حکومت کے خاتمے کے معاًبعد جب انہیں بھی برطرف کیا گیا تو یہ رائے عامہ تھی کہ اس اقدام پر امریکی حکومت بہت خوش ہے۔ اب جو مندرجہ بالا خبر میں بعض "بنیاد پرست" فوجی افسروں کی بغاوت کا سراغ بھی جنرل جاوید ناصر کی سرگرمیوں میں لگانے کی کوشش کی گئی ہے تو اس کے پس پردہ ناکام فوجی بغاوت کا رخ کردار کھلی امریکی مخالفت کی جانب موڑ کر واحد سپر طاقت کی مزید اور گہری ہمدردیاں حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اس کے مقاصد نظریاتی بھی ہیں اور سیاسی بھی۔ نظریاتی ان معنوں میں کہ امریکی حکومت کو باور کرایا جائے کہ پاکستان کے اندر احیائے اسلام کی قوتیں اس حد تک سرگرم عمل ہیں کہ کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا ہے لہٰذا امریکہ کو اپنے نظریاتی مقاصد کے پیش نظر موجودہ لبرل پاکستانی حکومت کی پشت پناہی میں کوئی کمی نہیں آنے دینی چاہیے۔

(بشکریہ "جسارت" کراچی)

دو بیگمات کی جنگ میں بنگلہ دیش کا مستقبل داؤ پر

عوام روٹی کے اور سیاستداں اقتدار کے بھوکے

بنگلہ دیش کی دو اہم ترین سیاسی جماعتوں کے درمیان طویل رسہ کشی کے نتیجے میں اس ملک کی غیر مستحکم جمہوریت انتشار کے اندیشے سے دوچار ہے اور حالیہ چند برسوں میں حزب مخالف کی پے درپے ہڑتالوں نے وہاں کی اقتصادیات اور ملک کو مفلوک الحالی سے نکالنے کی غرض سے وضع کردہ اصلاحی اقدامات کے پیر اکھاڑ دئے ہیں۔ 1991ء میں سولہ سال کے بعد جمہوریت کی طرف واپس آنے والے ملک میں جہاں بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی اور اپوزیشن عوامی لیگ نے مشترکہ کوشش سے ایچ ایم ارشاد کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔ وہی آپس میں آج دست و گریباں ہیں۔ اس طرح کہ آج عوام کو موجودہ سیاسی صورت حال کے پیش نظر بنگلہ دیش کے مستقبل کی طرف سے تشویش لاحق ہوگئی ہے۔

حالیہ حکومت مخالف مہم میں عوامی لیگ اور اس کے حامی گروہ عام انتخابات کرانے کی غرض سے فوری طور پر ایک غیر جانبدار نگراں حکومت کی تشکیل کا مطالبہ کررہے ہیں۔ دوسری جانب حزب مخالف کی طرف سے بیگم خالدہ ضیاء کی حکومت پر ضمنی انتخابات کے نتائج میں بددیانتی کا الزام ہے اور اسی لئے انہیں ایماندارانہ طور پر انتخابات کرانے کا اہل نہیں سمجھا جارہا ہے۔ حزب مخالف کے مطالبات پر عمل کرنے کے لئے خالدہ ضیاء اور بی این پی حکومت کو پارلیمنٹ توڑنے کے بعد منصب سے ہٹنا پڑے گا۔ اسی پارلیمنٹ سے حزب مخالف کے ممبران گذشتہ دسمبر میں باجماعت نکل گئے تھے۔

خالدہ ضیاء کا کہنا ہے کہ وہ انتخاب سے پہلے کسی غیر منتخب شخص کو نگراں حکومت سنبھالنے کی اجازت نہیں دیں گی۔ بی این پی کے سرکردہ ممبران کا کہنا ہے کہ کوئی بھی خارج از دستور اقدام ملک کو آئینی بحران میں ڈال دے گا جس کی بناء پر ایمرجنسی کے نفاذ اور اس جیسے دوسرے اقدامات ناگزیر ہوجائیں گے۔ عوامی لیگ کی صدر شیخ حسینہ واجد غیر جانبدار حکومت کے تحت انتخابات کرانے کے مطالبے کو لے کر بنگلہ دیش کے ایک بڑے اندرونی علاقے میں گھوم رہی ہیں۔ وہ بنگلہ

خالدہ ضیا

دیش کے بانی اور اپنے والد شیخ مجیب الرحمن کے نام کے سہارے رائے دہندگان کو یہ گوش گزار کرتی رہی ہیں کہ بی این پی گورنمنٹ کو اقتدار سے ہٹاکر ہی آزادانہ انتخاب کی ضمانت دی جاسکتی ہے

سیاسی حریفوں میں صف آرائی کے نتیجے میں آئے دن کام اور نقل و حرکت کے تعطل سے ایک طرف تو معیشت بری طرح متاثر ہورہی ہے تو دوسری طرف تخریب اور تشدد سے حریفوں کے مابین منافرت گہری ہوتی جارہی ہے اور وہ اپنے موقف میں پہلے سے زیادہ شدید ہوتے جارہے ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ شیخ حسینہ واجد جو حکومت پر بدعنوانی اور نااہلی کا الزام لگاتی ہیں انہوں نے یہ

حسینہ واجد

دھمکی دی ہے کہ اگر انتظامیہ کو ہٹانے میں متواتر ہڑتالیں ناکام رہیں تو وزیراعظم کی رہائش گاہ کا محاصرہ کیا جائے گا۔ خالدہ ضیاء نے حزب مخالف کے اس اقدام کو غیر قانونی قرار دیا ہے۔

اگرچہ حکومت اور حزب مخالف کی طرف سے برابر ناقابل مفاہمت اختلافات کا اظہار ہوتا رہتا ہے تاہم بنگلہ دیش کے عوام کی طرف سے ایسی کسی کوشش کا اظہار دیکھنے کو نہیں ملتا جس کی بناء پر یہ کہا جاسکے کہ وہ کوئی سیاسی مرکزیت کے خواہاں ہیں۔ مقامی "پاور اینڈ پارٹی سیشن ریسرچ سینٹر" کے تحت کرائے گئے رائے عامہ کے ایک سروے سے اندازہ ہوا ہے کہ بیشتر عوام کا اصل سروکار بحران سے پیدا شدہ حالات سے ہے نہ کہ اس کے پس پردہ سامنے آنے والے مسائل سے۔ دوسرے یہ کہ حکومت یا حزب مخالف کی طرف سے اختیار کردہ غیر مفاہمانہ موقف کے استمرار کے حامی افراد کی مقدار صرف دس فیصد تھی۔ گویا کہ عوام مفاہمت کے حق میں ہیں اور اس مطالبے کے حامی بھی کہ آزادانہ اور منصفانہ انتخاب ملک میں کرایا جائے۔ یعنی کہ عوام میں تو آزادانہ انتخاب کے مطالبے کی حمایت زور پکڑ رہی ہے لیکن خوشگوار فضا کیسے پیدا کی جائے اس پر سیاستدانوں کو سوچ بچار کرنا ہوگا، جذباتی ہوکر نہیں بلکہ حقیقت پسندی اور سیاسی عقل و شعور کو بروئے کار لاکر۔

بنگلہ دیش کی سیاسی فضا میں مذکورہ سروے کے نتائج کی صحت اس بات سے واضح ہے کہ گذشتہ چھ ماہ کی مدت کے تجربے سے پتا چلا ہے کہ اس دوران وہاں کی شہری اور سیاسی زندگی حیرت انگیز طور پر معمول کے مطابق رہی۔ مرکز میں سیاسی تعطل کا دور دورہ دیکھ کر یہاں کی تمام اہم سیاسی جماعتیں دیہاتوں کی خاک چھانتی دکھائی دیں گی تاکہ حلقوں کی سطح پر اس امید میں تیاریاں جاری رکھی جائیں کہ 1996ء میں انتخابات اپنے طے شدہ نظام العمل کے مطابق انجام پائیں گے۔

اگر اس ملک کے بے لچک سیاستدانوں نے اس امید پر پانی پھیرا تو بنگلہ دیش کے عوام اس کے وجود سے اب تک اقتدار کی جمہوری طور پر منتقلی کے عمل کا نظارہ نہ کرسکیں گے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر تعلق دار منیر الزماں کے مطابق اصل مسئلہ اس بات کا ہے کہ سرکردہ سیاسی شخصیتوں اور ان کی جماعتوں کی سیاسی حریفوں سے مفاہمت تو نہیں ہوجائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی سیاسی جماعتوں کو افہام و تفہیم کی صلاحیت ورثے میں ہی نہیں ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ابتدائی دور میں دو صدر مملکت ہلاک کردئے گئے اور تین سربراہان اپنے منصب سے ہٹنے پر مجبور کئے گئے۔

احزاب مخالف کی طرف سے پارلیمنٹ کا مسلسل بائیکاٹ ذہنی شدت کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی میدان ہارنے کے خوف سے اس کا وجود ہوا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ خطرہ ہمیشہ لگا ہوا ہے کہ جمہوری طریقے سے منتخب ڈھاکہ میں تشکیل ہونے والی کسی نئی حکومت کو اسی طرح کے بائیکاٹ اور حریفوں کے ساتھ رسہ کشی کا سامنا رہے گا۔ اور یہ صورت حال اس ملک کو برسہا برس سیاسی بے یقینی میں مبتلا رکھے گی۔ تاوقتیکہ موجودہ رہنما کسی مفاہمانہ صورت کو قبول کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر نہ کریں۔

بنگلہ دیشیوں کیلئے پاکستان کی زمین بھی تنگ

بنگلہ بولنے والوں اور بنگلہ دیشیوں کے لئے ہندوستان کی زمین تنگ ہوجانے کے بعد اب پاکستان بالخصوص کراچی میں بھی انہیں انہی مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ پاکستانی حکومت نے غیر ملکیوں کو نکالنے کی جو مہم چلائی ہے اس کی سب سے زیادہ زد بنگلہ دیشیوں پر پڑ رہی ہے مگر بنگلہ دیش کی حکومت نے یہ کہہ کر ان لوگوں کو واپس لینے سے انکار کردیا ہے کہ ان تمام لوگوں کے پاس بنگلہ دیشی شہری ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بنگلہ دیشی حکومت کی جانب سے ان لوگوں کو واپس لینے سے انکار کے باوجود کراچی انتظامیہ بنگلہ بولنے والوں اور کراچی کے شہریوں سے مختلف دکھائی دینے والوں کو وہاں سے ہٹانے میں مصروف ہے۔ اس مہم کے تحت گذشتہ دنوں تقریباً دو ہزار بنگلہ دیشیوں یا پردیسیوں کو یا تو گرفتار کرلیا گیا ہے یا حراست میں لے لیا گیا ہے۔ کراچی کی گودی میں کام کرنے والے بنگلہ دیشی مزدوروں کے ایک نمائندہ محمد سراج نے کراچی انتظامیہ پر اس قسم کا الزام لگایا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ کئی لوگوں کو رشوت لے کر چھوڑ دیا گیا ہے جبکہ بہت سے ابھی بھی جیل میں ہیں۔

اس صورت حال سے کراچی کے ساحل اور گودی میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ مزدوروں نے کام پر آنا بند کردیا ہے اور ماہی گیری کا کام بری طرح متاثر ہوگیا ہے جس سے حکومت کو بھی نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ یہاں کام کرنے والے دس ہزار بچے اور عورتیں بنگالی نژاد ہیں گویا وہاں کے ساٹھ فیصد مزدور بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ پاکستان ہر سال پندرہ کروڑ ڈالر کی مالیت کی مچھلی برآمد کرتا ہے اور اس صنعت سے کراچی میں ایک لاکھ افراد کو سہارا ملا ہوا ہے۔ مارچ 1994ء کے ایک سروے کے مطابق کراچی کی ایک کروڑ بیس لاکھ آبادی کا سولہ فیصد حصہ غیر قانونی تارکین وطن پر مشتمل تھا۔ جن میں تقریباً 80 فیصد پردیسی بنگلہ دیش کے تھے۔ کراچی میں برمی، افغانی اور ایرانی بھی مقیم ہیں۔ لیکن بنگالیوں کی کافی پوچھ ہے کیونکہ وہ محنتی ہوتے ہیں اور دوسرے لوگوں سے زیادہ ایماندار ہوتے ہیں۔

بہرحال ایک طرف جہاں انتظامیہ نے پردیسیوں بالخصوص بنگلہ دیشیوں کو نکالنے کا حکم دے رکھا ہے وہیں افسران کے لئے یہ درد سر بن گیا ہے۔ پہلی بات تو انہیں نکالنا مشکل ہے کیونکہ ایسی صورت میں مزدوری کرنے والوں کا قحط ہوجائے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ تر لوگوں کے پاس پاکستانی شناختی کارڈ اور دوسرے ضروری کاغذات ہیں۔ وہاں بھی غیر قانونی طریقے سے فرضی کاغذات بن جاتے ہیں جس کی بنا پر افسران شش و پنج میں مبتلا ہیں۔ بہرحال ہندوستان کے بعد پاکستان میں بھی بنگلہ دیشیوں کے لئے زمین تنگ ہوگئی ہے۔ بنگلہ دیشی اور پاکستانی حکومتوں کو تبادلہ خیال کرکے اس مسئلے کو حل کرنا چاہئے تاکہ غریب مزدوروں کے سامنے روزی روٹی کا مسئلہ نہ کھڑا ہوجائے۔

> ایک طرف جہاں انتظامیہ نے بنگلہ دیشیوں کو نکالنے کا حکم دے رکھا ہے وہیں دوسری طرف افسران کے لئے یہ درد سر بن گیا ہے پہلی بات تو انہیں نکالنا مشکل ہے کیونکہ ایسی صورت میں مزدوروں کا قحط ہو جائیگا اور دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ تر لوگوں کے پاس پاکستانی شناختی کارڈ موجود ہے۔

پاکستان کو امریکی اسلحہ کی سپلائی، ہندوستان کا شدید ردعمل

کیا عام انتخابات سے قبل دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ جائے گی

پاکستان کو امریکہ کی جانب سے تقریباً 37 کروڑ ڈالر کے ہتھیاروں کی سپلائی کے فیصلے اور ہندوستان کی جانب سے شدید اور جارحانہ ردعمل کے بعد کیا برصغیر کی فضاؤں پر جنگ کے بادل چھاگئے ہیں؟ یہ سوال آج کل دہلی کے سیاسی اور صحافتی حلقوں میں تیزی سے گشت کر رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کو ان ہتھیاروں کی سپلائی اور فرانس سے میراج طیاروں کے سودے کے بعد اس کا حوصلہ بڑھ گیا ہے اور ہندوستان میں

مایوسی چھا گئی ہے۔ حوصلے و جوش و خروش اور مایوسی و ناکامی پر قابو نہیں پایا گیا تو یقیناً جنگ کی صورت حال پیدا ہوجائے گی۔ ہندوستان کی جانب سے وزیر خارجہ، وزیر داخلہ، وزیر دفاع اور فوجی ماہرین کی شدید نکتہ چینی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جنگ کبھی بھی بھڑک سکتی ہے۔ اس اندیشے کو دونوں ملکوں کے اندرونی حالات سے تقویت ملتی ہے۔ جس طرح ہندوستان میں وزیراعظم پی وی نرسمہا راؤ تمام داخلی معاملات پر

ناکام ہیں اسی طرح بے نظیر بھٹو بھی داخلی امور میں بری طرح پسپا ہوئی ہیں اور دونوں ان حالات سے نبرد آزما ہونے کی جرات نہیں کر پا رہے ہیں۔ وزیراعظم کو اندازہ ہے کہ عام انتخابات میں خواہ بی جے پی جیتے یا نہ جیتے ان کی حکومت کے قیام کا بھی امکان معدوم ہے اس لئے اگر وہ انتخابات سے بچنے کا کوئی راستہ تلاش کرنے لگیں تو کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ اور بے نظیر بھی کراچی اور سندھ کے حالات سے بری طرح بوکھلائی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف اسلامی انقلاب کی کوشش نے بھی ان کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ گرچہ انہوں نے ایسی کوشش کرنے والوں کو پابہ زنجیر کر کے سلاخوں

کے پیچھے ڈال دیا ہے لیکن پھر بھی خطرہ تو برقرار ہی ہے انہیں یہ اندیشہ ہے کہ ابھی نہ جانے کتنے اس مہم میں لگے ہوں اور وہ کتنے فوجی افسران کو قید و بند کی صعوبتیں دیں گی۔ یہ اقدام بذات خود بغاوت کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ لہذا بے نظیر ان حالات

سے بچنے کے لئے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرتی جارہی ہیں تاکہ وقت پڑنے پر انہیں "استعمال" کیا جاسکے۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پاکستانی ہتھیاروں کا استعمال کس کے خلاف ہوتا رہا ہے۔

ادھر ہندوستان کے وزیر خارجہ مسٹر پرنب مکھرجی نے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان کو ملنے والے امریکی ہتھیاروں کا پوری طرح اور موثر ڈھنگ سے سامنا کیا جائے گا۔ اپنی وزارت سے متعلق پارلیمانی مشاورتی کمیٹیوں کی میٹنگ میں انہوں نے کہا کہ ہتھیاروں کے اس سودے کے

تئیں ہندوستان باخبر اور ہوشیار ہے۔ ہندوستان نے فرانس سے پاکستان کو ملنے والے چالیس میراج 2000 پر بھی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ وزیر خارجہ نے کہا کہ بڑے مغربی ممالک کے اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ فیصلوں سے ہمیں مجبور ہوکر ترقیاتی

پروگراموں کا پیسہ اپنی دفاعی پوزیشن کو مضبوط کرنے پر صرف کرنا پڑے گا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام آباد کو امریکی ہتھیاروں کی مجوزہ فروخت سے جنوبی ایشیا میں امن تحفظ اور استحکام کو فروغ نہیں ملے گا۔ وہ ہمیشہ اپنے ہتھیاروں کا استعمال ہندوستان کے خلاف کرتا رہا ہے۔ ہم بھی اس

صورت حال سے نمٹنے کے لئے ضروری قدم اٹھائیں گے کیونکہ ملک کا تحفظ کرنا حکومت کی پہلی ذمہ داری ہے۔

دریں اثناء ہندوستان کے چوٹی کے دفاعی ماہرین کا کہنا ہے کہ اس امریکی فیصلے سے برصغیر میں ہتھیاروں کی دوڑ شروع ہوجائے گی۔ سابق ڈپٹی چیف آف ایر اسٹاف ایر مارشل سی وی گولے کا کہنا ہے کہ امریکہ اور فرانس سے پاکستان کو اسلحہ کی سپلائی سے فوجی توازن نمایاں طور پر پاکستان کے حق میں ہوجائے گا۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان نے ہمیشہ اس خطہ میں ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کی کوشش کی ہے اور پاکستان کی طرف سے ایف 16 طیاروں کے حصول کے بعد ہی ہندوستان نے مگ 29 طیارے اور میراج 2000 حاصل کئے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ پاکستان کے پاس کثیر رول انجام دینے والے طیارے بڑی تعداد میں موجود ہیں اور وہ اعلیٰ ترین آلات جنگ سے لیس ہیں جبکہ ہندوستانی فضائیہ ان شعبوں میں پاکستان سے پیچھے ہے۔ پاکستان کا راڈار سسٹم اتنا موثر ہے کہ پاکستانی سرحد پار کرتے ہی ہندوستانی لڑاکا طیاروں کی شناخت ہوسکتی ہے۔ پی سی تھری اور یون طیارے حاصل کرنے کے بعد پاکستانی بحریہ کی پہنچ ہندوستانی بحریہ سے آگے بڑھ جائے گی۔

باریون میزائل جو پاکستان حاصل کرنے جارہا ہے وہ ہندوستانی بحریہ کی میزائلوں سے کہیں زیادہ بہتر معیار کے ہیں۔ علاوہ ازیں پاکستان کو پہلے سے خبردار کرنے کا نظام بھی بڑے پیمانے پر اسے حاصل ہوجائے گا۔

اس صورت حال نے ہندوستان کی تشویش میں یقینی طور پر اضافہ کردیا ہے اور اس خطرناک حالت سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہندوستان بھی ہتھیاروں پر اپنا بجٹ بڑھا دے گا جیسا کہ وزیر خارجہ نے اشارہ بھی دیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یقیناً اس خطے میں ہتھیاروں کی زبردست دوڑ شروع ہوجائے گی اور اس دوڑ کو مزید بھڑکا کر امریکہ اور مغربی ممالک اپنے مفادات کی تکمیل میں مصروف ہوجائیں گے۔ اس خطے میں ان کے مفادات اسی میں ہیں کہ دونوں ممالک زیادہ سے زیادہ اسلحہ خریدیں۔ امریکہ نے پاکستان کو ہتھیاروں کی سپلائی کا فیصلہ کرکے اس مہم کو شروع کروادیا ہے۔ ادھر دونوں ممالک کے اندرونی حالات بھی اس خطرناک صورت حال میں معاون ثابت ہورہے ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ عام انتخابات سے پہلے ہی برصغیر کی فضاؤں پر جنگ کے بادل چھا جائیں اور دونوں ممالک ایک اور جنگ کے عذاب میں گرفتار ہوجائیں۔ ●

کانگریس اور بی جے پی میں مسلم نوازی کا

مسلمانوں کو خوش ہوجانا چاہئے کہ وزیراعظم نے ان کی مفلوک الحالی کو دور کرنے اور ان کی اقتصادی، تعلیمی و سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لئے مختلف وزارتوں کو ہدایت جاری کردی ہے۔ انہوں نے ریاستی حکومتوں سے بھی اس کام میں جٹ جانے کی اپیل کی ہے اور انہیں یہ اطمینان بھی دلایا ہے کہ اس سمت میں کام کرنے کے لئے اگر پیسوں کی ضرورت ہو تو مرکز فنڈ بھی فراہم کرے گا۔ شرط یہ ہے کہ ریاستی حکومتیں اقلیتوں کی پسماندگی کو دور کرنے کی جدوجہد شروع کردیں۔ ادھر آپسی انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کے دلدل میں پھنسی ہوئی بی جے پی نے بھی مسلمانوں کو فراموش نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے وجود کی بقا کے اس نازک وقت میں بھی مسلمانوں کو ان کے مسائل کی تاریک سرنگ سے نکالنا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ مسلمان اس ملک میں ترقی کریں،

خوش حال ہوں اور قومی دھارے میں شامل ہوکر ملک کی اتحاد و یک جہتی کو قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کریں۔

یقیناً یہ باتیں مسلمانوں کے خوش ہونے کی

> یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کانگریس اور بی جے پی کی یہ مسلم دوستی عام انتخابات کے پیش نظر ہے ورنہ کہاں کانگریس اور بی جے پی اور کہاں مسلمانوں کے لئے فلاحی اسکیمیں اور ترقیاتی پروگرام۔ یہ بھی طے ہے کہ انتخابات ختم ہوتے ہی یہ ہوائی باتیں بھی ختم ہوجائیں گی اور لفاظی کرنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں رہ جائے گا۔

ہیں اور مسلمان خوش بھی ہوں گے۔ جو خوش نہیں ہوں گے انہیں زبردستی خوش کیا جائے گا۔ کیوں کہ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں نے جن میں ایک برسراقتدار ہے اور دوسری برسراقتدار

آنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ مسلمانوں کو ترقی کے عروج پر پہنچانے کا بیڑا اٹھالیا ہے۔ وزیراعظم نے اقلیتوں کی بہبود کے لئے تیار کئے گئے پندرہ نکاتی پروگراموں پر عمل کرنے پر زور دیا ہے اور

مختلف وزارتوں سے کہا ہے کہ وہ اقلیتوں کی بہبود کے لئے ترجیحی بنیاد پر اسکیمیں اور منصوبے بنائیں۔ پندرہ نکاتی پروگراموں کے نفاذ کا جائزہ لینے کے لئے بلائی گئی ایک وزارتی میٹنگ میں انہوں

نے کہا کہ ابتدائی مرحلہ میں یہ اسکیمیں ان 41 اضلاع میں نافذ ہوں گی جہاں اقلیتوں کی اکثریت ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ اقلیتوں سے متعلق پروگراموں کے نفاذ میں مرکز کو بہت اہم رول ادا کرنا ہوگا۔ مسٹر راؤ نے انسانی وسائل کی وزارت کو یہ بھی ہدایت کی ہے کہ وہ جلد ہی ایک ایسا جائزہ تیار کرے جس سے یہ معلوم ہو کہ جو تعلیمی مواقع ملک میں موجود ہیں ان سے مسلمان کس حد تک مستفید ہورہے ہیں۔ اقلیتوں کے مجموعی مسائل کے اس قسم کے جائزے سے یہ اندازہ بھی ہوگا کہ ان کی ترقی کے لئے حکومت کو کس حد تک کوشش کرنی چاہئے۔ وزیراعظم نے وزراء اور حکام سے کہا ہے کہ وہ مختلف ریاستوں میں پندرہ

اس شمارے کی قیمت پانچ روپے
سالانہ چندہ ایک سو روپے / چالیس امریکی ڈالر
یکے از مطبوعات
مسلم میڈیا ٹرسٹ
پرنٹر پبلیشر، ایڈیٹر محمد احمد سعید نے
تیج پریس بہادر شاہ ظفر مارگ سے چھپوا کر
دفتر ملی ٹائمز انٹرنیشنل
49، ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 سے شائع کیا
فون نمبر 6827018 ۔۔ 6926030
سری نگر بذریعہ ہوائی جہاز ساڑھے پانچ روپے

بے نظیر نے فوج اور امریکہ کو فتح کرلیا

لیکن کیا وہ داخلی مسائل حل کرنے میں بھی کامیاب ہوں گی

نظیر نے امریکہ کو خوش کرنے میں کامیابی حاصل کرلی اور اس کا انہیں انعام بھی مل گیا۔

لیکن فوج کو خوش کرلینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بے نظیر پاکستان کے مسئلے کو حل کرنے میں بھی کامیاب ہوگئی ہیں۔ کراچی اور سندھ میں ان کی ناکامی سب پر عیاں ہے۔ بہرحال اس ناکامی کے باوجود ان کی خارجہ پالیسی کا ستارہ آج کل عروج پر ہے۔ پریسلر ترمیمی ایکٹ کو ہٹاکر پاکستان کے لئے ہتھیار حاصل کرنا ان کی اولین ترجیح تھی جس میں حال ہی میں انہوں نے اس وقت کامیابی حاصل کرلی جب امریکہ نے کم از کم ایک بار کے لئے پریسلر ترمیم کو اٹھالینے اور اسلام آباد کو ہتھیار فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب پاکستان کو 370 ملین ڈالر کے ہتھیار مل جائیں گے۔ اگرچہ ان میں ایف 16 طیارہ نہیں ہے لیکن بعض ایسے ہتھیار شامل ہیں جس سے ہندوستان کو لازماً تشویش لاحق ہے۔ واضح رہے کہ پاکستان نے ایف 16 طیاروں کے ایک اسکویڈرن اور دوسرے ہتھیاروں کے لئے ایک ارب ڈالر سے زائد رقم پہلے ہی ادا کردی ہے۔ بقیہ رقم کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔

ابھی پاکستان کو ہتھیار سپلائی کرنے کے امریکی فیصلے کی سیاہی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ بے نظیر نے دوسری کامیابی حاصل کرلی۔ اقوام متحدہ کی تقریبات میں شرکت کرنے کے بعد پاکستان واپس ہوتے ہوئے وہ تھوڑے وقت کے لئے پیرس میں رک گئیں اور صدر شیراک سے مذاکرات کئے جس کے نتیجے میں فرانس نے اسلام آباد کو 40 میراج طیارے فروخت کرنے کی رضامندی دے دی ہے۔ پاکستان کا کہنا ہے کہ وہ ان طیاروں سے ایف 16 طیاروں کے نہ ملنے سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کرے گا۔ پاکستان کے پاس پہلے ہی سے کچھ میراج لڑاکا طیارے موجود ہیں

میراج طیاروں کی خریداری سے قبل پاکستان نے روس سے مگ 29 طیارے خریدنے میں دلچسپی ظاہر کی تھی لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہندوستان نے ماسکو سے اپنی دیرینہ دوستی کا سہارا لے کر اسلام آباد کو روسی ہتھیاروں سے محروم کردیا۔ لیکن پاکستان پھر بھی اس تاک میں ہے کہ روس سے ہتھیار خرید لے۔ دراصل پاکستان کو احساس ہے کہ فنڈ کے محتاج روس کے لئے بہت دنوں تک ہندوستانی دباؤ کو تسلیم کرنا مشکل ہوگا۔ اس لئے اسے اب بھی امید ہے کہ اسے روسی لڑاکا طیارے مل جائیں گے۔

پاکستان کو امریکی ہتھیار سپلائی کرنے کے فیصلے سے فطری طور پر ہندوستان کو مایوسی ہوئی ہے۔ یہاں کی حکمراں اور اپوزیشن پارٹیوں نے امریکی فیصلے کی زبردست مذمت کی ہے۔ مگر اپوزیشن کے سخت دباؤ کے باوجود حکومت امریکہ کے خلاف کوئی اقدام کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آتی۔ بلکہ اس کے برعکس ہندوستانی حکومت نے امریکہ میں متعین اپنے سفیر کے اس بیان سے خود کو علیحدہ کرلیا تھا جس میں انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر امریکہ پاکستان کو ہتھیار سپلائی کرتا ہے تو اس کے معاشی مفادات کو ہندوستان میں نقصان پہنچے گا۔ مگر وزیراعظم اور وزیر خارجہ نے اس سے بالکل الگ موقف اختیار کرتے ہوئے امریکی تاجروں کو یقین دلایا کہ امریکہ کے اس نئے "پاکستان نواز فیصلے" کے باوجود دونوں ملکوں کے معاشی تعلقات اثرانداز نہ ہوں گے۔ یہ خبر بھی ملی ہے کہ وزیراعظم اور وزیر خارجہ کے اس موقف کی وجہ سے امریکہ میں متعین ہندوستانی سفیر سدھارتھ شنکر رے کافی ناراض ہیں۔ اگرچہ سفیر اور وزیر خارجہ دونوں نے باہمی اختلاف سے انکار کیا ہے لیکن مبصرین کا خیال ہے کہ سفیر محترم شاید بہت جلد استعفی دے دیں۔

ہندوستانی سفیر کی بہ نسبت پاکستانی سفیر ملیحہ لودھی کامیابی کے راستے پر گامزن ہیں۔ ان کے بارے میں بھی خبر تھی کہ "پریسلر ترمیم" کو ختم کرانے میں ان کی ابتدائی ناکامی کی وجہ سے انہیں ہٹایا جانے والا تھا۔ مگر اب بے نظیر نے بہت کھل کر ان کی تعریف کی ہے اور اس طرح امید ہے کہ وہ اپنے عہدے پر برقرار رہیں گی۔

●

مقابلہ

رپورٹ۔سہیل انجم

اسے زندہ کرنے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن کیا اس پروگرام کے تن مردہ میں روح پھونکنے کی کوئی کوشش اس سے قبل کی گئی۔ وزیراعظم کو اب سے پہلے اس پروگرام کی اہمیت کا اندازہ کیوں نہیں ہوا۔ دراصل یہ پروگرام تو اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے زمانے ہی میں دم توڑ رہا تھا اور نرسمہاراؤ کے زمانے میں تو یہ بالکل مردہ ہوگیا۔ انہوں نے نہ تو اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اور نہ ہی دوسری اسکیمیں تیار کرنے کی کبھی کوئی کوشش کی۔ البتہ اب اچانک انہیں مسلمانوں کا خیال آگیا۔ لیکن یہاں بھی وزیراعظم کی چالاکی چھپ نہیں سکی۔ انہوں نے براہ راست طور پر کوئی عملی قدم اٹھانے کی ہدایت نہیں کی ہے بلکہ اسکیمیں اور پروگرام بنانے کا حکم دیا ہے اور ریاستوں کا دورہ کرکے اس پروگرام کے نفاذ کا جائزہ لینے کو کہا ہے۔ ظاہر ہے یہ کام تو اتنی جلدی ہوگا نہیں۔ کئی مہینے درکار ہوں گے اس کے لئے۔ اور پھر اسی دوران انتخابات شروع ہوجائیں گے۔ جلسے جلوسوں میں لیڈران اور وزراء تقریریں کرکے مسلمانوں کو بتائیں گے کہ دیکھو ہم تمہارے بھلے

کے لئے کیا کر رہے ہیں۔ ہم تو تمہیں اتنا چاہتے ہیں اور تم ہم سے دور بھاگ رہے ہو۔ وزیراعظم نے یہ جو کہا ہے کہ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے مرکز کو بہت اہم رول ادا کرنا ہے۔ سو فیصد صحیح ہے۔ اب تک مرکز ہی تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں اہم رول ادا کرتا رہا ہے۔ فسادات کا مسئلہ ہو یا بابری مسجد کا۔ تعلیمی معاملہ ہو یا سماجی۔ روزگار کا معاملہ ہو یا ملازمتوں کا ہر میدان میں مرکز نے اہم رول ادا کیا ہے اور اگر اسی طرح وہ اہم رول ادا کرتا رہا تو یقیناً مسلمانوں کے مسائل حل ہوجائیں گے اور ان کے لئے ترقی کے دروازے کھل جائیں گے۔

بی جے پی کا بھی مسلمانوں پر بڑا احسان ہے کہ وہ انہیں یاد رکھے ہوئے ہے۔ نہ صرف یاد رکھے ہوئے ہے بلکہ ان کے مسائل کو حل کرنے کے لئے بے تاب و بے چین ہے۔ ابھی گذشتہ دنوں علی گڑھ میں بی جے پی کا اقلیتی کنونشن منعقد ہوا تھا اب پھر ایک اجلاس علی گڑھ میں ہورہا ہے جس میں مسلمان بی جے پی میں "بڑے پیمانے" پر شرکت کر رہے ہیں۔ جی ہاں! اترپردیش بی جے پی اقلیتی سیل کے سکریٹری مسٹر مجاہد قدوائی کی باتوں پر یقین کریں تو علی گڑھ کے آس پاس کے پانچ ہزار سے زائد مسلمان بی جے پی میں شریک ہورہے ہیں۔ ملی ٹائمز کے ذرائع کے مطابق بی جے پی نے دوسرے علاقوں میں بھی اقلیتی کنونشن اور مسلمانوں کے لئے پروگراموں کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے۔ چونکہ وہ اندرونی چپقلش اور گروہ بندی میں پھنس گئی ہے اس لئے سردست یہ معاملہ ڈھیلا پڑ گیا ہے لیکن پھر بھی ان پر عمل آوری کے عزم کا اظہار کیا جارہا ہے۔ مرلی منوہر جوشی، کلراج مشرا اور کلیان سنگھ اس میدان میں لگے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے مسلمانوں میں ان کی زبردست مقبولیت ہے بالخصوص کلیان سنگھ کی۔ اس لئے یہ لیڈران مسلمانوں کو اپنے قریب لانے کی پوری جدوجہد کر رہے ہیں۔ بڑی ناشکری ہوگی اگر مسلمان کلیان سنگھ کی خدمات کو فراموش کردیں گے اور ان کی اپیل پر لبیک نہیں کہیں گے۔ باوثوق ذرائع کے مطابق بی جے پی الیکشن جیتنے کے بعد مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے مختلف پروگراموں پر عمل کرنا چاہتی ہے۔ اس کا اعلان بھی وہ الیکشن میں کرے گی۔ مسلمانوں سے متعلق پروگراموں کا انچارج عارف بیگ کو بنایا گیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی اور سماجی پسماندگی کو دور کرنے کے پروگراموں کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کانگریس اور بی جے پی کی یہ مسلم دوستی عام انتخابات کے پیش نظر ہے ورنہ کہاں کانگریس اور بی جے پی اور کہاں مسلمانوں کے لئے فلاحی اسکیمیں اور ترقیاتی پروگرام۔ یہ بھی طے ہے کہ انتخابات ختم ہوتے ہی یہ ہوائی باتیں بھی ختم ہوجائیں گی اور لفاظی کرنے کے لئے بھی ان کے پاس کچھ نہیں رہ جائے گا۔

●

عنقریب اسلام امریکہ کا دوسرا بڑا مذہب ہو جائے گا

80 ہزار امریکی مشرف بہ اسلام

امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کی صورت حال اگرچہ پیچیدہ ہے مگر انتہائی حوصلہ افزاء ہے۔ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور اسلام تیزی سے لوگوں کی زندگی میں داخل ہورہا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق یہاں مسلمانوں کی تعداد سات ملین ہوچکی ہے۔ اسی طرح ایک اندازے کے مطابق 2015ء تک امریکہ میں اسلام جو اب تیسرا بڑا مذہب ہے دوسرے بڑے مذہب کی جگہ لے لے گا۔ جہاں تک مساجد اور اسلامک سینٹر کا تعلق ہے ان کی تعداد 843 ہے۔ اسلامی اسکولوں کی تعداد 165 اور ایسوسی ایشنوں کی تعداد 426 ہے۔

ایڈورڈ سعید کے مطابق اسلام کے بارے میں مستشرقین ایک متعصبانہ سوچ کے مالک رہے ہیں یہ متعصبانہ سوچ یورپ سے ایک علمی لہر کی شکل میں اٹھی اور اس نے 1940ء کے بعد امریکہ کی سیاسی سوچ پر بھی غلبہ حاصل کرلیا۔ جس کے نتیجہ میں امریکہ میں عرب شیوخ کو خصوصا۔ ایک غیر پسندیدہ اور فرضی کرداروں کی شکل میں پیش کیا گیا اور مسلمانوں کو عموما ایک غیر مہذب، غیر ترقی یافتہ قوم قرار دیا گیا۔ ان کے لئے بنیاد پرست، دہشت گرد، جنونی وغیرہ کی اصطلاحات استعمال کی جانے لگیں۔

1993ء کے اوائل میں جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بم کا دھماکہ ہوا تو میڈیا نے تمام مسلمانوں کو موردالزام ٹھہرایا۔ اس تعصب نے امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں میں مذہبی تشخص کا جذبہ پیدا کیا چنانچہ اشاعت اسلام کے لئے مختلف ادارے، تنظیمیں اور سوسائٹیاں معرض وجود میں آئیں۔ اس صورت حال کے سبب اب خود امریکی اسکالر اس بات کی طرف خاصی توجہ دے رہے ہیں کہ امریکہ میں اسلام یا مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ جبکہ اسلام تاریخی، سماجی، علمی اور سیاسی میدان میں بھی امریکی کلچر کو متاثر کررہا ہے وہاں امریکی سیاست بھی مسلمانوں کے ذہن کو ایک نیا رخ، ایک نئی سوچ، ایک نیا انداز فکر اپنانے پر مجبور کررہی ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق اٹھارہویں صدی کے شروع میں امریکہ میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوچکی تھی۔ ان کا تعلق زیادہ تر مشرق وسطی کے ممالک فلسطین، شام، اردن اور لبنان سے تھا۔ ان میں سے بیشتر لوگ تعلیم اور کاروبار سے منسلک ہوگئے۔ اپنی کمیونٹی کے مفادات اور اپنی مذہبی شناخت کو قائم رکھنے کے لئے انہوں نے مساجد اور مختلف اسلامک سنٹر قائم کئے۔ ابتدائی طور پر یہ مسجدیں ڈیٹرائٹ، فلاڈلفیا، شکاگو اور نیویارک میں قائم ہوئیں۔ تارکین وطن کی ایک اور بڑی لہر نے بیسویں صدی کی نصف دہائی کے قریب امریکہ کا رخ کیا۔ یہ لوگ زیادہ تر ہندوستان اور پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان ملکوں کے علاوہ روس اور مشرقی یورپ سے بھی مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد یہاں پہنچی۔ 1980ء۔ 1990ء کی دہائی میں بے شمار پاکستانی اور عرب نوجوان اعلی تعلیم اور روزگار کے حصول کے لئے یہاں پہنچے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان میں ڈاکٹرز اور انجینئرز بھی شامل ہیں جو 70 کی دہائی میں یہاں آکر آباد ہوئے۔ خمینی انقلاب کے بعد ایران سے بھی بہت سے مسلمان یہاں پہنچے اسی طرح مصر، ترکی، کویت، سعودی عرب، عراق، افغانستان، سوڈان، تیونس اور دوسرے افریقی ممالک سے بھی مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد یہاں پہنچ چکی ہے۔

مساجد اور اسلامک سنٹر

جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے امریکہ میں مساجد و اسلامک سنٹرز کی تعداد 843 کے لگ بھگ ہے۔ مسجدیں زیادہ تر اپنی مدد آپ کے تحت کام کررہی ہیں۔ جو افراد یہاں نماز پڑھتے ہیں وہ چندہ دے کر اس کا انتظام و انصرام ایک امام کے سپرد کردیتے ہیں۔ بعض مساجد میں مختلف مذاہب کے لوگوں سے علمی مکالے کی روایت بھی موجود ہے۔

یہاں فلاڈلفیا کے قریبی مضافات اور بروک کی مسجد "باوا محی الدین" کا تذکرہ کردیا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ باوا محی الدین مسجد میں نماز جمعہ کے بعد ملحقہ ہال میں باہم ملاقات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جہاں بعد نماز جمعہ کھانا بھی پیش کیا جاتا ہے۔ مسجد میں اگرچہ عورتوں کے لئے عبادت کی جگہ علیحدہ ہے تاہم اس بڑے ہال میں مرد و زن کی ایک دوسرے سے گفتگو پر کوئی پابندی نہیں۔ لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں اور اسلام سے متعلق لٹریچر فراہم کیا جاتا ہے۔ باوا محی الدین جو کہ سری لنکا سے یہاں آکر آباد ہوگئے تھے ان کے ارشادات اور ملفوظات پر مبنی لٹریچر بھی یہاں تقسیم کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر کوئی مسلمان تبلیغی نقطہ نگاہ سے کوئی تحریر طبع کرانا چاہے تو اس کے چھاپنے کا بھی مفت انتظام کیا گیا ہے۔ مساجد اور اسلامک سنٹرز میں سے ایک مثال ٹولیڈو اوھاؤ کی ہے۔ یہ مسجد 1954ء میں قائم ہوئی تھی اور اب تک انتہائی موثر ادارہ بن چکی ہے۔ واشنگٹن، لاس انجلز اور ٹیکساس میں اب بڑی بڑی مسجدیں بنائی جارہی ہیں۔ نارتھ کیرولینا کا اسلامک سنٹر افریقی مسلمانوں کے لئے ایک مرکز فراہم کررہا ہے۔

مساجد کی ایک فیڈریشن بھی قائم کی گئی ہے۔ جس کا نام فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشن رکھا گیا ہے۔ اس کا صدر دفتر ڈیٹرائٹ میں ہے۔

طلبہ تنظیم

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب مسلمان طلباء نے یہاں کی مختلف یونیورسٹیوں کا رخ کیا تو انہوں نے آگے چل کر اپنی تنظیمیں قائم کرلیں۔ ان میں مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن نہایت فعال تنظیم ہے۔ اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ نے مختلف مسلم تنظیموں کو منظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ امریکن مسلم کونسل واشنگٹن مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کررہا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق 2015 تک امریکہ میں اسلام جو اب تیسرا بڑا مذہب ہے دوسرے بڑے مذہب کی جگہ لے لے گا۔ جہاں تک مساجد اور اسلامک سینٹرس کا تعلق ہے تو ان کی تعداد 843 ہے۔ اسلامی اسکولوں کی تعداد 165 اور ایسوسی ایشنوں کی تعداد 426 ہے۔

امریکہ میں رہنے والے افریقی نسل کے بے شمار لوگ اسلام کو بطور مذہب قبول کرچکے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق 1886ء میں اسلام کو بطور ایک علامت استعمال کیا گیا کہ کس طرح افریقی لوگوں کو اکٹھا کیا جاسکے یعنی ایک پلیٹ فارم پر لایا جاسکے۔ اس تحریک کے روح رواں ٹیموتھی ڈریو تھے۔ بعد ازاں انہوں نے اپنا نام نوبل ڈریو علی رکھا۔ 1929ء میں ولیس فرض محمد نے ڈیٹرائٹ میں اس تحریک کو تقویت پہنچائی۔ فرض محمد کے بارے میں قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ترکی النسل تھا یا پھر ایرانی النسل؟

اس نے ایک تحریک شروع کی جس کا نام تھا شمالی امریکہ کے میدانوں میں اسلام کی گمشدہ قوم کی بازیابی۔ فرض محمد نے علی جاہ محمد کی قیادت کو تسلیم کیا۔

علی جاہ (عالیجاہ) محمد نے ایک تنظیم بھی بنائی۔ اس تنظیم کی بے شمار تعلیمات اسلام کے عقائد سے مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ "سفید فام لوگ شیطان ہیں" ایک افریقی مسلم کے لئے ان تعلیمات کا پابند ہونا لازم تھا۔ ملکولکس نے اس تنظیم میں شمولیت حاصل کی۔ انہوں نے مکہ مکرمہ کا دورہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ اسلام عجمی اور عربی اور کالے اور گورے میں کوئی تمیز نہیں رکھتا اور انسانی اخوت کا درس دیتا ہے تو انہوں نے اس تنظیم سے علیحدگی اختیار کرلی۔ علی جاہ محمد کا اپنا بیٹا وارث دین محمد بھی راہ راست پر آگیا اور بعد ازاں ہزاروں بلکہ لاکھوں افریقن۔ امریکن مسلمانوں کا لیڈر بن گیا۔ وارث دین محمد کے پاس جونہی اس تحریک کی قیادت آئی اس نے نسلی تعصب کا خاتمہ کیا۔ اس تنظیم کا نام بدل کر اب "دی امریکن بلالین کمیونٹی" رکھا گیا۔ اب اس کا نام "امریکن مسلم مشن" کے طور پر سامنے آیا ہے۔

علی جاہ محمد کی تحریک کی اصل تعلیمات کو آگے چلانے میں لوئیس فرخان کا نام لیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریک کا نام "دی نیشنل آف اسلام" رکھا۔ اس کے متوازی کچھ اور تنظیمیں بھی وجود میں آئی ہیں ان میں "دارالاسلام" اور "انصار اللہ" نمایاں ہیں۔

دارالاسلام تحریک نے اب تک 20 مسجدیں قائم کی ہیں جو زیادہ تر نیویارک اور فلاڈلفیا کے علاقوں میں ہیں۔ اس کا دائرہ کار کینیڈا میں بھی پھیل گیا ہے۔ امام یحیی عبدالکریم اس کے لیڈر ہیں جن کو "امیرالمومنین" کا خطاب بھی دیا گیا ہے۔ اس تنظیم کے پیروکار نہایت منظم ہیں۔

انصار اللہ کی سربراہی ان دنوں امام عیسی نامی شخص کے حصہ میں آئی ہوئی ہے۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد بلیک نیشنلزم اور اسلام کو ایک نظر سے دیکھنا ہے۔ مصر اور سوڈان کی پرانی تہذیب کے یہ داعی قرآن کی طرح بائبل کے متن کو بھی مستند تسلیم کرتے ہیں۔

قید خانہ جات

کالے امریکیوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے میں دیگر اسباب میں سے جیلیں بھی ایک سبب بنی ہیں۔ اکثر کالے امریکی جرائم میں ملوث ہونے کے سبب قید کرلئے جاتے ہیں۔ چنانچہ مسلم مشن قید خانوں میں اپنی تبلیغی مساعی سے ان کو اسلام کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ تصور توبہ ان کو اسلام سے قریب تر لانے والے عوامل میں سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

اب تک 40 سے 80 ہزار تک امریکی مسلمان ہوچکے ہیں۔ ان میں خصوصا وہ عورتیں شامل ہیں جنہوں نے مسلمانوں سے شادی کی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جو اسلام میں عورت کی حیثیت اور اہمیت سے متاثر ہیں۔

●

بقیہ۔ زنانے دار تھپڑ

حمایت کی۔ رہبرو اس وقت حکومت پنجاب کے سیکورٹی ایڈوائزر اور اعلی افسر تھے جنہوں نے روپن دیول کا ساتھ دیا۔ رہبرو پنجاب گورنمنٹ کو پہلے بھی گل کو نشے میں دھت ہوکر قابل اعتراض حرکتوں سے باز رکھنے کے سلسلے میں آگاہ کیا تھا۔ اور گل نے ان سے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ شراب پی کر پارٹیوں میں نہیں جائیں گے۔ تاہم سدھارتھ شنکر رے نے اسے ریاستی امور میں مداخلت پر محمول کرتے ہوئے اس انتباہ پر کوئی توجہ نہ دی۔

آٹھ برسوں کی اس جدوجہد کا نتیجہ کم از کم یہ نکلا ہے کہ اس معاملے کے تئیں عوامی فکر کا انداز بدلا ہے اور مقدمہ اب بجاج بنام گل نہ رہ کر ریاست بنام گل ہوگیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ریاست کسی عورت کی عزت نفس اور وقار کے تحفظ میں کیا کردار ادا کرتی ہے اور کے پی ایس گل تک انصاف کے ہاتھوں رسائی کے لئے کیا اقدام کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ گل کو کوئی ایسی سزا نہ مل پائے جو عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے والے عادی مجرموں کے لئے باعث عبرت نہ ہو تاہم ایک بات ضرور سامنے آئی ہے جو عورتوں کے حق میں ہے کہ ان میں ایسی اخلاقی جرات پیدا ہوگئی ہے جس کے سہارے وہ جنسی استحصال کے مقابل صف آرا ہوسکتی ہیں۔

بقیہ۔ چندرا سوامی

افسران نے لکھا تھا کہ سی بی آئی کے افسران سوامی کے سیاسی اثر و رسوخ اور راؤ سے ان کے تعلقات کے پیش نظر جانچ کا کام بے خوف ہوکر نہیں کر پا رہے ہیں۔ بہرحال چندرا سوامی کے ستارے بری طرح گردش میں ہیں اور ان کے تنتر منتر کا علم انہیں ان آفات سے نکلنے میں کوئی مدد نہیں کررہا ہے۔

کئی مہینے تک دس سالہ حمیدہ کی عصمت کی دھجیاں تار تار ہوتی رہیں

آخر ان مجرموں اور خاطی پولیس والوں کو سزا کب ملے گی؟

دو سال قبل آٹھ خاکی پوشوں کی ہوسناکی کا نشانہ بننے والی دس سالہ بنگلہ دیشی لڑکی حمیدہ (فرضی نام) کا واقعہ ممکن ہے آپ کو یاد ہو اور اگر نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اس ملک میں ہر سال عصمت دری کا شکار ہونے والی تقریبا ہزار عورتوں میں سے ایک حمیدہ بھی تھی اور اس کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مظلومین میں اکثریت لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ اسی طرح باپ کے ہاتھوں معصوم بیٹی کی آبرو ریزی اور قتل کا دلدوز واقعہ جب سننے اور پڑھنے کو ملتا ہے تو لمحاتی رنج، خوف زدگی اور نفرت کا اظہار ہماری طرف سے ضرور ہوتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہم نے اس اصول کو تسلیم کرلیا ہے کہ عریانیت قابل نفریں اور مغرب کے خراب اثرات کی دین ہے لیکن عصمت دری ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا نہ صرف حصہ بلکہ اس کا سربستہ راز ہے۔ اس لئے ہم نے بھی جہاں تک ممکن ہو اس پر خاموشی اختیار کرنا سیکھ لیا ہے کیونکہ زیادہ تر مجرم اپنے جرم کی تمام تر سنگینی کے باوجود بری ہوجاتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1992ء میں دہلی میں رپورٹ شدہ عصمت دری کے 276 واقعات میں ماخوذ صرف 46 افراد کو سزا ہوسکی اور باقی چھوڑ دئے گئے۔

ایسے وقت میں جب عورتوں کے مسائل پر عالمی کانفرنسیں ہونے لگی ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ چند منٹ نکال کر حمیدہ کی روداد الم بھی سن لیں۔ اور جو کچھ انصاف کے تحفظ کے نام پر حمیدہ کے ساتھ پیش آیا وہ بھی غور سے سننے کے لائق ہے۔

حمیدہ بنگلہ دیش میں اپنے باپ، سوتیلی ماں کئی بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ باری سال ضلع کے ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ دو سال پہلے کی بات ہے کہ باپ کی مرضی سے اس کا کوئی دور کا رشتہ دار رشید خاں بہتر اور آرام دہ زندگی کا لالچ دے کر اسے دہلی لایا اور ترلوک پوری کی ایک جھگی میں رہنے لگا۔ اس کے باوجود کہ حمیدہ ابھی صرف دس سال کی تھی رشید خاں نے دہلی لاتے ہی اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ تین ماہ تک تقریبا ہر رات پاس پڑوس کے لوگ حمیدہ کی آہ وزاری سنتے رہے آخر ایک دن انہوں نے مداخلت کی اور رشید خاں کو جھگی سے باہر گھسیٹ کر اس کی جوتاکاری کی۔ حمیدہ سے نجات پانے کے خیال سے اس نے اسے سیماپوری میں مقیم ایک شناسا مہتاب کے سپرد کردیا (یا بیچ دیا؟) مہتاب نے خود بھی نہ صرف حمیدہ سے منہ کالا کیا بلکہ اپنے جاننے والے دو پولیس والوں اور اوم پرکاش نام کے ایک "عزت دار شادی شدہ اور شریف" شخص سے جسم فروشی بھی کروائی۔ کئی روز تک وہ باری باری اس کی آبروریزی کرتے رہے۔ کبھی اوم پرکاش کے گھر میں اور کبھی پولیس کے لئے بنے ہوئے ان بوتھوں میں جن پر یہ پراعتماد فقرے لکھے رہتے ہیں: "دہلی پولیس۔ چوبیس گھنٹے آپ کے لئے اور آپ کے ساتھ"۔ معاشرے کے ان عزت دار اور شریف انسانوں کے ہاتھوں متعدد بار اپنی آبرو لٹاکر یہ دس سال کی لڑکی ایک دن ان کے چنگل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ سیماپوری میں وہ اپنا دکھڑا کسی کے آگے بیان تو نہیں کرسکتی تھی کیونکہ ہندی بولنا جانتی نہیں تھی۔ آخر کسی بنگلہ دیشی نے اس کی مدد کی۔

حمیدہ کی بپتا سن کر لوگ اسے پولیس اسٹیشن لے آئے جہاں حسب عادت پولیس نے کیس درج کرنے سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ لڑکی پاگل ہے۔ ہندی روزنامہ "جن ستہ" میں کمار سنجے سنگھ کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد ہی پولیس اس کیس کے اندراج پر مجبور ہوئی۔ حمیدہ نے مجرمین کی شناخت کی اور ایک میگزین میں شائع ایک رپورٹ کے مطابق مجرموں نے اقبال جرم بھی کرلیا۔ طبی رپورٹ سے عصمت دری ثابت بھی ہوگئی۔ لیکن جیسا کہ ہماری انوکھی فلاحی ریاست کا دستور رہا ہے حمیدہ کو جوونل ڈلشن سنٹر نرمل چھایا میں رکھ دیا گیا گویا کہ جرم کا ارتکاب اس نے ہی کیا تھا لیکن جسے ہم فخر سے قانونی کارروائی کہتے ہیں اس کی پرتیں جس طرح کھلتی گئیں حمیدہ کا معاملہ اسی قدر الجھتا گیا۔ اور جب پولیس والے ہی عزت و آبرو کے لٹیرے ہوں تو یہ قانونی کارروائی کچھ زیادہ ہی قابل تعریف ہوجاتی ہے۔

مقدمے کی پہلی سماعت میں ملزموں کو حاضر

جب خارش زدہ حالت میں حمیدہ عدالت میں آئی تو جج نے بھی بار بار وہی سوال دہرایا اور اس نے زار و قطار روتے ہوئے جواب دیا کہ یہ سب باتیں بار بار کیوں پوچھتے ہو پہلے ہی میں سب کچھ بتا چکی ہوں۔

معصوم حمیدہ کو "نرمل چھایا" میں پناہ تو کیا ملتی وہ اس کے لئے جیل ثابت ہوا جہاں کی عورتیں اس سے چھیڑ چھاڑ کرتیں اور بار بار پوچھتیں کہ پولیس والوں نے تیرے ساتھ کیسے کیسے اور کیا کیا۔

عدالت نہیں کیا گیا تھا۔ جج کو یہ بتایا گیا کہ پولیس اسٹیشن میں کی گئی شناختی پریڈ میں لڑکی مجرموں کو پہچاننے میں ناکام رہی۔ جج نے یہ بھی سوال کیا کہ شناختی پریڈ عدالت میں یا جیل میں کیوں نہیں کرائی گئی اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ مظلوم لڑکی کا بیان محض اس بہانے سے تحریر نہیں کیا گیا کہ کوئی اس کی ترجمانی کرنے والا نہ تھا۔ جب یہ واقعہ دہلی یونیورسٹی کی ایک ٹیچر روما دیب برتا نے اخبار میں پڑھا تو ترجمانی کی خدمات انہوں نے پیش کیں پھر بھی مجرموں کے بجائے مظلوم کو سزا دینے کا سلسلہ نہیں رکا۔

معصوم حمیدہ کو "نرمل چھایا" میں پناہ تو کیا ملتی وہ اس کے لئے جیل ثابت ہوا جہاں کی عورتیں اس سے چھیڑ چھاڑ کرتیں اور بار بار پوچھتیں کہ پولیس والوں نے تیرے ساتھ کیسے کیسے اور کیا کیا۔ ستم یہ کہ جب خارش زدہ حالت میں حمیدہ عدالت میں آئی تو جج نے بھی بار بار وہی سوال دہرایا اور اس نے زار وقطار روتے ہوئے جواب دیا کہ یہ سب باتیں بار بار کیوں پوچھتے ہو پہلے ہی میں سب کچھ بتا چکی ہوں۔

دو سال گذر گئے۔ ابھی تک حمیدہ کا بیان پوری طرح ضابطہ تحریر میں نہیں آسکا۔ اور آپ کے خیال میں مجرموں کا کیا حشر ہوا؟ وہ پھر اپنی یونیفارم میں اپنی متعینہ جگہوں پر آگئے اور حمیدہ کی حمایت میں بولنے والے کسی بھی شخص کو ڈرا دھمکا دیتے ہیں۔ دس سال بعد جب قانون کی ضابطہ جاتی کارروائی مکمل ہوجائے گی تو وہ یہ ثابت کرچکے ہوں گے کہ حمیدہ پاگل ہے اور اس کے خلاف کوئی کیس نہیں بنتا۔ جہاں تک حمیدہ کا سوال ہے تو اس کا بچپن اس کے لئے قید خانہ بن گیا جہاں ایک نارمل اور خوشحال زندگی کے تمام مواقع اور امکانات معدوم ہوچکے ہیں۔ جب ہمارے ملک کی ریشم پوش خواتین عالمی کانفرنسوں میں دھواں دھار تقریریں کریں گی تو کیا وہ یہ بھی اعتراف کرسکیں گی کہ وہ ایسے ملک کی نمائندگی کررہی ہیں جہاں کا قانون عصمت دری کی شکار لڑکیوں اور عورتوں کو تو سزا دیتا ہے لیکن مجرموں کو آزاد گھومنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ (انگریزی سے تلخیص و ترجمہ)

یہ صرف پولیس سربراہ کے ہی نہیں بلکہ پولیس ذہنیت کے رخساروں پر بھی زناٹے دار تھپڑ ہے

عورت کی عزت سے مذاق نہیں کیا جاسکتا

پنجاب میں دہشت گردی کی سرکوبی سے سرشار انتظامیہ کے بلیو آئیڈ بوائے یعنی پنجاب کے ڈائرکٹر جنرل آف پولیس کے پی ایس گل اور آئی ایس افسر روپن دیول کے درمیان قانون کی جنگ کو بعض لوگوں نے دو افسران میں زور آزمائی کو بعض نے تو ہندو سکھ تصادم کے مظاہرے سے تعبیر کیا۔ آٹھ سال پہلے جب کے پی ایس گل نے ایک سرکاری پارٹی میں روپن کے ساتھ بدسلوکی کی تھی تو چند ہی افراد ایسے تھے جنہوں نے ایک عورت کے وقار کو مجروح ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ یہ مثال تھی اس زعم کی کہ کوئی بڑا پولیس افسر اپنے سے کم درجے کی افسر اور وہ بھی عورت کے کولھے پر دھپ لگاکر لطف اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ روپن دیول نے اس ہتک پر مصلحت اندیشانہ خاموشی اختیار کرنے کے بجائے تمام ہندوستانی عورتوں کے وقار پر ضرب کاری تصور کرتے ہوئے آخر اس معاملہ کو عدالت تک لے گئیں اور آٹھ سال کی جانفشانی کے بعد وہ ملک کے عدلیہ کو یہ باور کراسکیں کہ ان کا نقطہ نظر درست تھا۔ اور اسی لئے وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی فتح ہندوستان کی تمام مظلوم اور بلا منصب و عہدہ استحصال کی شکار تمام عورتوں کی فتح ہوئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ روپن دیول کو بڑے

کٹھن مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ مقابلہ نہ صرف ایک اعلی پولیس افسر اور وہ بھی ایک طرح سے قومی ہیرو سے تو تھا ہی حکومت کی مشینری سے بھی تھا جس کی پوری حمایت گل کو حاصل تھی مثلا اس وقت ریاستی چیف سکریٹری آر پی ادھا نے کہا کہ یہ عورت کولھے پر چٹکی کاٹنے جیسی معمولی بات پر اپنے بڑے آدمی کے وقار کو داغدار کیوں کررہی ہے۔ آخر اسے ملک اور صوبے کی عزت کا بھی خیال ہونا چاہئے اور اگر ایسا ہوا بھی تو گل کی طرف سے تحریری معذرت نامہ کیا کافی نہیں ہے۔ پنجاب کے گورنر سدھارتھ شنکر رے نے تو یہاں تک کہا کہ عوامی اور قومی مفاد میں روپن کو اپنی زبان بند رکھنی چاہئے کیوں کہ حکومت کسی طرح بھی پولیس کو اتنا ذلیل نہیں کرسکتی ایسے وقت میں جب کہ وہ دہشت گردی سے نبرد آزما ہے۔ چیف سکریٹری نے فرمایا کہ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ کیونکہ صاحب نے تو صرف تمہیں چھوا ہی تھا شکر کرو کہ نوبت اس سے آگے کی نہیں آئی۔ پولیس کی دراز دستیوں کے ان پرداروں نے نہ صرف معاملہ کو دبانے کی جان توڑ کوشش کی بلکہ روپن دیول اور ان کے گھر والوں پر طرح طرح سے دباؤ ڈالے اور ان سب کو جان سے مار ڈالنے کی بھی دھمکی دی۔ لیکن یہ تمام کوششیں روپن کو ہلا نہ سکیں اس میں ان کے شوہر اور والد کا پوری طرح تعاون حاصل رہا

۔ ماں نے ضرور مخالفت کی تھی بیٹی کی روایتی بدنامی کے خوف سے۔ روپن نے ایک پریس انٹرویو میں انصاف تک پہنچنے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ میری جنگ نہ گل سے ہے نہ حکومت سے بلکہ ایسے رجحان سے ہے جس کے تحت ہزاروں ہندوستانی عورتیں ظلم و ہوس کا نشانہ بنتی ہیں اور اسی لئے انہیں ہندوستان کی مظلوم عورت کا نمائندہ سمجھا جائے۔

روپن دیول کو اس معاملہ کو آگے تک لے جانے میں مالی طور پر کافی زیربار ہونا پڑا ہے جس کی وجہ سے ان کا پراویڈنٹ فنڈ تقریبا خالی ہوگیا۔ پنجاب کے گورنر اور ہائی کورٹ کی سطح تک گل کے گماشتوں نے کیس کو مختلف بہانوں سے دبوائے رکھا۔ آخر روپن کو سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ اس مہم میں اپنے عزیزوں کے علاوہ 95 آئی ایس افسروں کا تعاون بھی ملا جنہوں نے وزیراعظم کو قراردادیں بھیجیں۔ اسی طرح کی زیادتیوں اور بدسلوکیوں سے گزری ہوئی عورتوں اور ان کی حامی تنظیموں نے بھی ان کی پرجوش

باقی صفحہ 12 پر

"میں کوئی سات صدیوں تک ابلیس کا سیاسی مشیر رہا ہوں"

باغی رفیق کے بعض دلچسپ انکشافات

ابلیس کے ہیڈ کوارٹر کا انکشاف چھٹی قسط

کانشی رام اور مایاوتی کی آمریت نے بی ایس پی کو دفن کر دیا

یوپی کے گورنر موتی لال وورا صحیح دستوری راستہ اسی وقت دیکھ سکے جب وزیراعظم غیر ملکی

مایاوتی

دورے سے واپس آئے۔ نتیجتاً یوپی اسمبلی تحلیل کردی گئی۔ لیکن اسمبلی تحلیل نہ کرکے صدر راج نافذ کرنے کے فیصلے نے اترپردیش کی سیاست میں مزید گندگی شامل کردی۔ توقع کے مطابق بی جے پی اور دوسری پارٹیوں نے مل کر ممبران اسمبلی کو خریدنے کی کوشش کی تاکہ وہ اپنی حکومت بنا سکیں۔ خرید و فروخت کے اس کھیل میں سب سے زیادہ نقصان بی ایس پی کا ہوا۔ کانشی رام اور مایاوتی کی آمرانہ روش کی وجہ سے پارٹی ایک بار پھر ٹوٹ گئی ہے۔

جس دن اسمبلی تحلیل کی گئی اسی دن اس سے کچھ قبل سابق ریاستی وزیر رام لکھن ورما کی قیادت میں چالیس سے زائد بی ایس پی ممبران اسمبلی نے مایاوتی کو ہٹاکر جناب ورما کو اپنا لیڈر منتخب کرلیا اور ملائم سنگھ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس سے بی جے پی کو زبردست صدمہ پہنچا۔ کیونکہ وہ اس کوشش میں تھے کہ کم از کم اتنے ہی ممبران کی وفاداری خرید کر یوپی میں اپنی حکومت بنالیں۔ جناب ورما نے مایاوتی پر الزام لگایا کہ وہ پیسہ لے کر بی جے پی کی حمایت کرنے والی تھیں مگر اقلیتی طبقہ کے ممبران نے ان کی چال ناکام بنادی۔

رام لکھن ورما کے اس اقدام کو مایاوتی نے رد کرتے ہوئے انہیں چار دوسرے ممبران اسمبلی اور پارٹی کے ریاستی صدر کے ساتھ پارٹی سے نکال دیا۔ مسٹر ورما کا کہنا تھا کہ ان کے ساتھ 53 ممبران اسمبلی ہیں۔ انہوں نے مایاوتی کی تنقید کرتے ہوئے کانشی رام کی قیادت میں بھرپور اعتماد کا اظہار کیا۔ لیکن مایاوتی نے اس دعوے کو تسلیم نہ کرتے ہوئے ایک دن اپنے غنڈوں کو بھیج کر پارٹی کے ریاستی آفس پر قبضہ کرلیا۔

کانشی رام

کلیان سنگھ

جس وقت لکھنؤ میں یہ سب ہو رہا تھا کانشی رام شہر سے باہر تھے۔ وہ آئے اور انہوں نے ایک بار پھر مایاوتی پر پورے اعتماد کا اظہار کیا۔ مسٹر ورما اور دوسروں کے پارٹی سے اخراج کی تصدیق کی اور اسی کے ساتھ 39 ممبروں کو واپس بلالیا۔ تادم تحریر باقی ممبران اب بھی مسٹر ورما کے ساتھ تھے۔ کانشی رام دراصل اس لئے کامیاب ہوسکے کہ صدر جمہوریہ نے اسمبلی تحلیل کردی۔ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو کانشی رام ان ممبران کی وفاداریوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئے ہوتے۔ اسمبلی تحلیل ہونے کے بعد ان لوگوں کو صاف نظر آنے لگا کہ آئندہ انتخابات میں ان لوگوں کو بی ایس پی کے علاوہ کسی اور پارٹی کا ٹکٹ نہ مل سکے گا۔ مسٹر ورما بھی اپنی جگہ خوش ہیں۔ کیونکہ وہ اور دوسرے لوگ اندازہ لگا چکے ہیں کہ بی ایس پی کا مستقبل روز بروز تاریک ہوتا جارہا ہے اور یہ کہ اب ان کا مستقبل ملائم سنگھ کے ساتھ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بی ایس پی کا ہریجنوں میں اچھا خاصا اثر ہے۔ لیکن کانشی رام اور مایاوتی دونوں کی آمرانہ روش سے خوددار ہریجن لیڈر بھی ان سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ یہ بات بھی طے ہے کہ محض ہریجنوں کے بل بوتے پر بی ایس پی یوپی کی سیاست میں دوسری پارٹیوں کے امیدواروں کو ہرانے یا جتانے میں مدد دے سکتی ہے اور خود ریاستی اسمبلی میں اپنی تعداد بڑھانے سے قاصر رہے گی۔ آئندہ انتخابات میں اپنی ناقص کارکردگی کے لئے بی ایس پی خود ہی ذمہ دار ہوگی خصوصاً اس کے مرکزی رہنما کانشی رام اور مس مایاوتی۔

●●

بقیہ۔۔راؤ کے سیاسی گرو

بنتے ہی ان کی قسمت کھل گئی۔ راؤ نے "احسانوں" کا بدلہ اپنے ہاتھوں سے دیا۔ اور اب خواہ وزارت میں توسیع ہو یا کسی کو وزارت سے ہٹانا ہو تمام فیصلوں میں این کے شرما کا مشورہ شامل رہتا ہے۔ ہرشد مہتہ والے کیس میں انہوں نے ہی ثالثی کی تھی۔ اس وقت راؤ کے حق میں بیان دینے کے لئے دیوی لال کو انہوں نے ہی راضی کیا تھا۔ جمیل الیاسی سے بھی ان کے انتہائی خوشگوار تعلقات ہیں۔ دہلی میں ائمہ کنونشن انہیں کی کوششوں سے ہوا تھا اور اطلاعات کے مطابق الیاسی کو انہیں کے توسط سے ایک خطیر رقم حاصل ہوئی تھی۔ ابھی پچھلے دنوں بریلی میں راؤ کا دورہ کروانے میں بھی انہیں کا رول رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی مسلم تنظیموں سے ان کے انتہائی خوشگوار تعلقات ہیں۔

●

پارسائی کا ڈھونگ رچانے والی پارٹی کی بد دیانتی

آر ایس ایس، جن سنگھ اور بی جے پی کا تحریک آزادی سے کوئی تعلق نہیں تھا

تحریر - امولیہ گانگولی

بی جے پی کو پہنچنے والے نقصانات پر اس کے مخالفین کے چہروں پر مسکراہٹ اس خیال سے مچل رہی ہے کہ آخر پرانی للچ نے پارٹی کو پھر اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور وہ اس میدان میں پہلے سے موجود ناپسندیدہ پارٹیوں کی سطح پر اتر آئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گجرات اور دیگر صوبوں کے واقعات نے کسی بڑی تبدیلی کو اختیار کرنے کے لئے رائے دہندگان کے جذبے کو سرد کر دیا ہے۔

تاہم یہ خیال ضروری طور پر ہی درست ہوسکتا ہے کیونکہ گروہ بندی تو جن سنگھ کے زمانے میں بھی ہوتی تھی اور اگر اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی تو اسی لئے کہ پارٹی بہت چھوٹی سی تھی اور اس کے اندر کی خانہ جنگی کا ملک کے دوسرے حصوں پر کوئی اثر پڑتا نہیں تھا۔ مخالفت کرنے والوں کو نکال کر یہ تاثر دے دیا جاتا تھا کہ وہ منضبط تنظیم ہے اور بظاہر پارٹی کے تمام ممبران اس خیال پر سنجیدگی سے قائم تھے۔ بات آج بھی وہی ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ آج چونکہ وقت کے ساتھ پارٹی کافی بڑی ہوچکی ہے اس لئے اس کے اندرونی اختلافات سیاسی منظرنامے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ حیرت اس پر نہیں ہونی چاہئے کہ پارٹی کی وسعت نے اس کے اتحاد کو مجروح کیا ہے بلکہ اس پر کہ پارٹی کے ممبران کو حالیہ تبدیلیوں پر اتنا ہی تعجب ہے جتنا کہ ملک کے دوسرے لوگوں کو۔ اس سے اپنی پارٹی کی حقیقی نوعیت سے خود ان کی بے خبری اور سنجیدہ غلط فہمی کا اظہار ہوتا ہے کہ پارٹی قومی مفاد کے تئیں وفادار افراد پر مشتمل ہے۔

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا بی جے پی کے موجودہ مسائل نے خود اپنے کردار کی بد احتسابی سے تو سر نہیں ابھارا ہے۔ کہا جاتا تھا کہ بی جے پی یا یوں کہہ لیجئے کہ سنگھ پریوار کئی آواز میں، بولتا ہے اور لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ قول کا یہ تضاد ایک دانستہ حکمت عملی کا جزو تھا جس کی ضرورت بعض حساس موضوعات پر مختلف تنظیموں کے دباؤ کے تحت محسوس کی گئی تھی۔ مثلاً وشو ہندو پریشد متھرا اور کاشی کی عبادت گاہوں کو آزاد کرانے کا ارادہ کیا تو بی جے پی چلانے لگی کہ یہ دونوں جگہیں اس کے ایجنڈے پر نہیں ہیں۔ لیکن کسے یقین آئے کہ بی جے پی کا اصل

وفف یہی رہے گا۔ ایسا محسوس کیا جاتا تھا کہ پارٹی مرکز میں برسر اقتدار آنے کے لئے وقت کو دھکیل رہی ہے۔ اس طرح کی غلط فہمی اس کی فعالیت کا جزو لاینفک بن چکا ہے جس کا بہترین مظاہرہ ایودھیا کے سانحے پر ہوا جب بابری مسجد کے تحفظ کے لئے بی جے پی کی یقین دہانیوں پر خود اس کی آنکھوں کے سامنے دھول ڈال دی گئی اور جو کچھ اس کے جنونی حامیوں نے کیا اس سے معلوم ہوا کہ یقین دہانیوں میں بدنیتی چھپی ہوئی تھی اور اس طرح دوسروں کو دھوکہ دے کر اس نے خود کو بھی دھوکہ دیا ہے۔ ایک ایسی تنظیم میں جس کا ایک فرد مسلمانوں کو زہریلا سانپ کہتا ہو اور دوسرا نسبتاً معتدل مزاج شخص تاریخ کی سیاہیوں کا حساب مسلمانوں سے چکانے کی آواز لگاتا ہو اس میں کوئی بھی اپنی جگہ آسانی سے بنالے گا۔ ظاہر ہے کہ نظریاتی اور عملی مسائل پر ایسی تنظیم میں بے سمتی کا امکان بہت زیادہ رہتا ہے اور شاید بی جے پی انجانے میں اس غلطی کا شکار ہوگئی ہے۔

گجرات کے واقعہ سے پارٹی کے ذمہ دار افراد کی طرف سے لگائے بعض ایسے الزامات بھی سامنے آئے ہیں کہ اس کا تعلق مافیا اور کالا دھندا کرنے والوں سے ہے اور اس طرح پارٹی کے چہرے پر بد عنوانی کے ایک اور داغ کا اضافہ ہوگیا ہے۔ یہی حال مہاراشٹر کا ہے۔ کانگریس کے مقابلے میں بی جے پی کو درپیش زیادہ پریشانیوں کا سبب یہ ہے کہ اگرچہ کانگریس کی حالت بھی دگرگوں ہے لیکن موخرالذکر نے اپنی پارسائی کا راگ الاپنے کا رجحان اختیار کرکے بہت بڑی غلطی کی اور اس پارسائی کے زعم کی بنیاد اپنے تئیں قائم کئے گئے غلط اندازے پر تھی۔

جیسا کہ بی جے پی خود کو واحد قوم پرست پارٹی اور ملک و عوام کی بہبود کے لئے دل سے کوشاں رہنے کا دعوی کرتی ہے اس کے لئے یہ سب کرنا ضروری بھی تھا۔ لیکن سب سے بڑی مشکل اس راہ میں یہ ہے کہ آر ایس ایس، جن سنگھ ،بی جے پی دھڑے کو ایسے واحد سیاسی گروہ کی حیثیت حاصل رہی ہے جس کا تحریک آزادی سے کوئی تعلق نہیں رہا کیونکہ برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد گاندھی نے ہندو، مسلمان اور دیگر فرقوں کے افراد کو لے کر کی تھی اس لئے مسلمانوں و زہریلے سانپ کہنے والے لوگ تحریک آزادی میں شریک کیسے سمجھے جاسکتے ہیں۔ اس کے برعکس بی جے پی کل ہندو پسندانہ تحریک آزادی سے پہلے اور اس کے بعد دونوں ادوار کی ہندوستانی سیاست سے میل نہیں کھاتی بلکہ واقعہ ہے کہ گاندھی کے منظر عام پر آنے کے وقت سے اس نے مذہب کا لبادہ پہن کر سرخروئی حاصل کی اور اپنے سیاسی مفاد کے حصول کے لئے مذہب کا استعمال اس کے لئے بہت کارگر رہا جو اس کے مسلمان مخالف نعروں اور پروپیگنڈے میں ظاہر ہے جو آج بھی ہمارے معاشرے میں پوری طرح موجود ہے۔

یہ ایک الگ کہانی تھی۔ پیش نظر تجزیہ کا تعلق اس بات سے ہے کہ بی جے پی کو اپنے نقوش کی تصویر پیش کرتے وقت، ذاتی اور تنظیمی سطحوں پر دیانتداری سے کام لینا چاہئے تھا۔ اور یہیں وہ ناکام رہی۔ اس سے انکار نہیں کہ ہندو سادھو کو اقتدار کی خواہش اسیطرح ہوسکتی ہے جیسے کسی سیاستداں کو اور وی ایچ پی اور چندرا سوامی جیسے مہاتماؤں کی سرگرمیاں اس کا کھلا ثبوت ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ عوام اپنے رہنماؤں سے اعلی معیار کے برتاؤ کی توقع رکھتے ہیں اگرچہ اکثر بے سود ہی سہی انہیں یہ انتظار رہتا ہے کہ کوئی نیک نام شخص ان کی رہنمائی کے لئے آئے۔

یہی وجہ تھی کہ 1984ء میں ایک نیک نام شخص کا اور 1989ء میں اس سے زیادہ نیک نام شخص کا انتخاب ہوا لیکن دونوں موقعوں پر عوام نے دھوکہ کھایا۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ راجیو گاندھی اور وی پی سنگھ عام دھارے کی سیاست کی راہ سے آئے تھے اور بی جے پی نے تقسیم کرنے کے نظریے کے ساتھ نیچے سے سر ابھارا تھا۔ اس لئے اس کے زوال کا مطلب یہ ہے کہ ہماری رنگا رنگی تہذیب کو لاحق خطرہ کسی حد تک کم ہونے لگا ہے۔ یہ حقیقت کہ بی جے پی ہندوستانی طرز زندگی میں رچے بسے تنوع اور نیرنگی کا مذاق اڑایا ہے باعث تشویش ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے خلاف جڑ پکڑ لینے والا تعصب زندہ رہے گا اور ہندو ازم کے مفاد کے تحفظ کے نام پر سیاسی مداری عوام کے جذبات کا سودا کرتے رہیں گے۔ ●

کیا یہ نرسمہا راؤ کے سیاسی گرو ہیں؟

اس وقت ان کی جیب میں کم از کم پندرہ ممبران پارلیمنٹ اور پانچ وزراء ہیں چندرا سوامی کے بعد یہ دوسری شخصیت ہیں جن کی کار کا راستہ وزیراعظم کے سنتری بھی نہیں روک سکتے اور سوامی کی کار کی طرح ان کی کار بھی دندناتی ہوئی بالکل اندر تک چلی جاتی ہے۔ اخبارات اور سیاست کی دنیا میں تو لوگ انہیں تھوڑا بہت جانتے ہیں لیکن عوام ان کی سحر انگیز شخصیت سے ایک دم لاعلم ہیں۔ یہ اس وقت وزیراعظم کے دست راست اور بالواسطہ طور پر ملک کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ راؤ کے اہم فیصلوں میں ان کا مشورہ شامل ہوتا ہے اور ان کے چاہنے والوں کی تعداد بھی سوامی کی مانند کم نہیں ہے۔ یہ ہیں پنڈت این کے شرما۔ ین لے شرما ہفتے میں تین چار بار وزیراعظم سے ملتے ہیں اور ہر بار تین چار گھنٹے ان کی رہائش گاہ پر گزارتے ہیں۔

مسٹر شرما چند سال قبل لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا میں ایک کلرک تھے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے اور بسوں کے دھکے کھاتے تھے۔ لیکن آج راؤ صاحب ان پر اس قدر مہربان ہیں کہ یہ ہندوستان کی دوسری اہم شخصیت بن گئے ہیں۔ آج ان کے پاس "ماروتی 1000" کار ہے اور کروڑوں کی لاگت کی رہائشی کوٹھی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کروڑوں کی جائداد الگ ہے۔

نرسمہا راؤ جب وزیراعظم بنے تو انہیں ملازمت میں ترقی دے دی گئی حالانکہ اس میں قواعد و ضوابط کو بری طرح نظرانداز کیا گیا۔ آج وہ کبھی کبھی دفتر جاتے ہیں اور آٹھ ہزار روپے تنخواہ پابندی سے
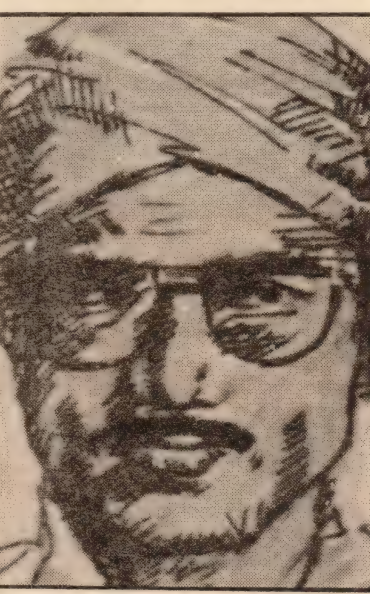
ان لے لھانے میں جمع ہوجاتی ہے۔ ان لے اخراجات شاہانہ ہیں ایک اندازے کے مطابق کم از کم پچاس ہزار روپے ماہانہ ان کا خرچ ہے، جتنی ان کی تنخواہ ہے اتنی یہ نوکروں میں لٹا دیتے ہیں۔

کچھ لوگ این کے شرما کو چھوٹے چندرا سوامی کہتے ہیں، کیونکہ دونوں میں بہت مماثلت ہے۔ دونوں وزیراعظم کے گرو ہیں اور دونوں کی گاڑیاں بلا روک ٹوک اندر تک جاتی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دونوں ہی اقتدار کے ایوان میں دلالی کرتے ہیں۔ لیکن چندرا سوامی آج جو ہیں اس کے لئے انہیں چالیس سال تک محنت کرنی پڑی جبکہ این کے شرما نے محض چار سال میں یہ سب حاصل کرلیا ہے۔ شروع میں ان کے تعلقات دیوی لال کے چھوٹے بیٹے رنجیت سنگھ اور رتنالر پانڈے اور متنک سنگھ جیسے ایک دو ممبران پارلیمنٹ ہی سے تھے۔ انہی کی مدد سے انہوں نے راجیو گاندھی اور ان کے سکریٹری وی جارج وغیرہ سے تعلقات بنائے۔ چندر شیکھر سرکار کو گرانے میں رنجیت سنگھ اور این کے شرما نے پردے کے پیچھے سے کام کیا۔ راجیو کے قتل کے بعد شرما کی قسمت کا تالا کھل گیا۔ اس قتل کے بعد انہوں نے راؤ سے کہا تھا کہ آپ ہی وزیراعظم بنیں گے۔ الیکشن کے دوران وہ مسلسل راؤ کے رابطے میں رہے۔

راجیو کے قتل کے بعد جب کانگریسی سونیا کا موڈ بھانپنے میں لگے تھے تو اس وقت بھی شرما راؤ کے لئے لابنگ کر رہے تھے۔ راؤ کے وزیراعظم

باقی۔ صفحہ 14 پر

مونس کے وفد کا دورۂ گیان واپی

مونس تنظیم کی ایک اہم میٹنگ گاندھی سنگھرالیہ پٹنہ میں 23 اگست 1995ء کو ہوئی۔ اس میٹنگ میں سابق وزراء، وکلاء، ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، تجار اور دیگر شعبہ جات زندگی سے منسلک اہم شخصیتوں نے حصہ لیا۔ میٹنگ کی صدارت جناب شبیر احمد ایڈوکیٹ پٹنہ ہائی کورٹ نے کی۔ محمد کمال الظفر جنرل سکریٹری مونس نے تمام شرکاء کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ ماہ مونس کی عام نشست ہوئی تھی جس میں بھاگل پور کے مجرموں کو سزا دلانے کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالا گیا تھا لیکن ہم نہایت دکھ کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ بھاگل پور فساد کی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کی بنیاد پر ریاست بہار کے وزیراعلیٰ نے 5 جولائی 1995ء کو ودھان پریشد میں اعلان کیا تھا کہ 3 ماہ کے اندر بھاگل پور فساد میں ملوث تمام مجرموں کو سزا دی جائے گی آج دو ماہ بیس دن ہوگئے لیکن سزا تو درکنار انہیں عہدہ سے برطرف بھی نہیں کیا گیا ہے۔ ریاست بہار کے ڈائرکٹر جنرل آف پولیس گیان پرساد دھورے کو ریاست کے نہایت حساس مقام پر اب تک برقرار رکھا گیا ہے اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ ڈمریا، امام گنج کا تذکرہ کرتے ہوئے محمد کمال الظفر نے کہا کہ اس علاقہ میں تقریباً 300 مسلمان قتل کردئے گئے لیکن افسوس اب تک ملزموں کی گرفتاری تو دور کی بات ہے مہلوکین اور متاثرین کو معاوضہ بھی نہیں ملا۔ 1989ء سے قتل کا جو سلسلہ ہوا وہ اب تک جاری ہے۔

مونس کے اس اہم اجلاس میں جن لوگوں نے تقریر کی اور بحث میں حصہ لیا ان کے نام ہیں: محمد کمال الظفر، اخلاق احمد سابق وزیر، عبدالمنان ایڈوکیٹ، محمد شبیر احمد ایڈوکیٹ، محمد ریاض احمد، محمد ریاض احمد آتش، شارق اجتے پوری جنرل سکریٹری انڈین یونین مسلم لیگ، ایس ایچ رحمان جنتا دل لیڈر، صغیر الحق، ڈاکٹر محبوب عالم سید شاہ شمیم، اعجاز احمد، تابش امام نائب صدر یوتھ گیا۔

دریں اثناء مونس کا ایک وفد محمد کمال الظفر جنرل سکریٹری مونس کے زیر قیادت بتاریخ 6 اکتوبر بنارس کے گیان واپی مسجد پہنچا۔ وہاں مفتی شہر، خطیب بنارس و گیان واپی مسجد کے امام جناب عبدالباسط صاحب سے ملا اور تمام حالات کا جائزہ لیا۔ گیان واپی مسجد کے سلسلہ میں گذشتہ ماہ یہ اطلاع اخبارات میں آئی تھی کہ وشو ہندو پریشد نے جل ابھیشیک کے دوران گیان واپی مسجد کے جنگلا کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس خبر میں کسی قسم کی صداقت نہیں تھی۔ گیان واپی مسجد کے کسی بھی حصے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ گیان واپی مسجد میں نمازیوں سے خطاب کرتے ہوئے مفتی باسط صاحب نے فرمایا کہ جب تک اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کریں گے دنیا کی کوئی طاقت ہمارا نقصان نہیں پہنچا پائے گی۔ ایک بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے محمد کمال الظفر نے کہا کہ ہمیں اپنے دلوں سے خوف و ہراس کے سایہ کو دور کرنا ہوگا اور فسطائی طاقتوں کو کچلنا ہوگا تاکہ ملک متحد رہے۔ وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس کا اس ملک میں صرف ایک ہی پروگرام ہے مسلمانوں کو مشتعل کرنا اور حکومت پر قبضہ کرنا۔ ہمیں ان کے اشتعال میں نہیں آنا ہے بلکہ منظم ہوکر ان کو اس ملک سے باہر کردینا ہے۔ مسلمانوں میں آپس میں جب تک اتحاد رہے گا اسے نقصان نہیں پہنچے گا۔ جس دن انتشار ہوگا ہم معمولی کیڑے کی طرح مسل دئے جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اپنی قیادت پر از سرنو نظر ڈالنی ہوگی اور بے باک، مخلص اور ایماندار قیادت کو اگلی صف میں لانا ہوگا۔ وفد میں جناب مولانا وجیہ الدین صاحب، جناب تسلیم الدین صاحب، جناب مرتضیٰ صاحب اور جناب لئیق صاحب شریک تھے۔

آفس سکریٹری
مونس پٹنہ

کیا بہار میں حکومت نام کی کوئی چیز نہیں ہے؟

بہار میں سرکار نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ لالو سرکار ذات پات، محض کھوکھلی نعرے بازی اور غنڈہ گردی کو لے کر چل رہی ہے اور مسلمانوں کو محض فریب دے کر چاپلوسی کرکے اپنی سیاست کی روٹی سینک رہی ہے۔ لہٰذا یہاں صوبہ بہار کے رگ و پے میں جو وبا سب سے زیادہ مسلم کش ہے وہ لالو کا انداز شاطرانہ ہے ایک طرف میڈیا پر اپنے تقاریر میں شری لالو پرشاد یادو مسلم یادو کا مکروہ نعرہ دیتے ہیں، دوسری جانب وہی ان کے یادو (جسے وہ کہتے ہیں) کے ہاتھوں معصوم بے زبان مسلمانوں پر ظلم و استبداد برپا کئے جاتے ہیں۔ پہلے تو گھر بار اجاڑ دئے جاتے ہیں قتل و غارت گری کا ناٹک کیا جاتا ہے اور پھر جو بچے کھچے خانماں برباد افراد ہوتے ہیں انہیں جیل کی سلاخوں میں بند کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک مدت تک مقدمہ چلائے جانے کے بعد جھوٹی گواہی کی بناء پر انہیں مظلوموں کو جیل کی طویل مدت تک ہوا کھانے کے لئے جھونک دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال پچھلے تمام فرقہ وارانہ فساد جیسے، بھاگل پور، رانچی، لوہردگا، پورنیہ، فاربس گنج، سیتا مڑھی وغیرہ کا جائزہ لے کر آئینہ کی صورت سچائی دیکھی جاسکتی ہے۔ خود سمستی پور ضلع میں بھی کلیان پور بلاک کے تحت انصار احمد، عنایت علی دونوں بھائی کا بہیمانہ قتل ان ہی لوگوں کی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھا کہ یہاں بھی فرقہ وارانہ فساد بھڑکاکر ہریجنوں سے بدتر حالت والے عنایت علی و انصار علی کے لئے کچھ لوگوں نے احتجاج کیا بھی تو اس کے تیور گھٹانے کے لئے لالو جی کے چہیتے جنتا دل کے ضلع مٹھادھیش نے اس وقت کے پولیس سپرنٹنڈنٹ نیرج سنہا کی رہائش گاہ کو سیکڑوں لٹھیتوں کے ذریعے گھیر لیا گیا کہ قاتلوں میں سے کسی کی گرفتاری نہ ہو۔ آخر شری نیرج سنہا ہی ان شاطر مجرموں کے آگے ہتھیار ڈال گئے اور مجرموں کی گرفتاری روک دی گئی۔ خیر اس طرح کے حادثے کا گویا سلسلہ سا ہی چل رہا ہے۔

کوثر بھگوت پوری سمستی پور

پولیس اور مجرموں میں سازباز

دربھنگہ ضلع میں روز بروز بڑھتے ہوئے جرائم اور پولیس انتظامیہ کی خاموشی اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ وہ غریبوں کے ساتھ نہیں بلکہ جرائم پیشہ عناصر کے ساتھ ہے۔ یہاں ویسے تو روزانہ ایک دو آدمی ناانصافی کے شکار ہوتے ہی ہیں اور مجرموں کے ہاتھ موت کے گھاٹ اتار دئے جاتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں جسے سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

گذشتہ دنوں بینی پور بلاک کے بہیڑی گاؤں کی بھاگو دیوی جس کا سسرال اسی بلاک کے ٹیٹھی گاؤں میں تھا اپنی ساس، سسر اور شوہر کے ذریعہ راتوں رات ہی جلاکر راکھ کردی گئی۔

یہ واقعہ ہے گذشتہ 9 ستمبر کی رات کا اس وقت جب سارا عالم گہری نیند میں تھا اس وقت سسر لال بہاری بھگت، ساس رام پری دیوی اور شوہر رگھوناتھ بھگت نے مل کر اسے مبینہ طور پر مار ڈالا۔ پڑوس کی ایک عورت کے بیان کے مطابق اسے پہلے نیند کی دوا دی گئی پھر گاؤں کے کنارے میدان میں جاکر آگ لگا دی۔ اس بات کی خبر جب بھاگو دیوی کے باپ کو ملی تو وہ فوراً 11 ستمبر کو بہیڑی تھانہ میں تینوں ملزموں کے خلاف رپورٹ درج کرائی۔

اور اب وہ ایس پی، ایڈیشنل ایس پی، پی ڈی ایس پی اور نہ جانے کتنے سرکاری افسروں کا روزانہ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے لیکن کوئی بھی اس کی مدد کرنے میں دلچسپی نہیں لے رہا ہے۔

شاہد سلام۔
خان چوک دربھنگہ

یہ کروڑوں مسلمانوں کی خواہش ہے

پہلی بار ملی ٹائمز پڑھنے کا موقع ملا، پڑھ کر ایسا لگا واقعی مارکیٹ میں ایسا پیپر موجود ہے جو عالم اسلام کو ایک نئی روشنی دے سکتا ہے اور دل کے جذبات کو لوگوں تک پہنچا سکتا ہے۔

جناب سید حامد صاحب کا مضمون "اب وقت آگیا ہے کہ ایک اور مسلم یونیورسٹی کے قیام کا ڈول ڈالا جائے" پڑھا یہ صرف حامد صاحب کی ہی نہیں بلکہ کروڑوں مسلمانوں کی خواہش ہے صیہونی سازشوں کی کامیابی کا واحد سبب مسلمانوں کی جاہلیت ہے۔ ہندوستان میں مسلم عوام پر ہندو تہذیب کا چڑھتا رنگ اور بگڑے ہوئے معاشرے کا واحد سبب تعلیمی پسماندگی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یونیورسٹی کھولنے کے ساتھ ساتھ تعلیم کی ایک زبردست مہم چلائی جائے۔

عتیق عالم مئوناتھ بھنجن (یوپی)

عمر نوح کی دعا

ملی ٹائمز کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا بخدا آپ اپنی کاوشوں میں کامیاب ہیں۔ اللہ آپ کو مزید سرخ روئی عطا کرے آپ کے اس اخبار میں جہاں دنیا جہاں کی معلومات ہیں وہاں قوم کو بیدار کرنے کا بھی کافی مواد بھی موجود ہے۔ اور یہی ان کے دارین میں خیر و برکت کا باعث بنے گا۔ اخبارات کے تمام مضامین دل کو بھاگئے آپ یقین مانیں یا نہ مانیں ہمارے ایک دوست نے اس اخبار کی پانچ کاپیاں خرید لی اور بہی خواہوں میں تقسیم کی۔ میں نے اخبار کے ہر ہر صفحہ کا بغور مطالعہ کیا ہے اور یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کی صحافت بے باک اور بے لاگ ہے خدا ہماری قوم کو مقدر دے کہ وہ اس بہترین اخبار کی پذیرائی کرے۔ نیز آپ نے قیمت کے بارے میں جو لکھا ہے وہ بھی ہمیں منظور ہے۔

سراج حسین نظام آباد (آندھرا پردیش)

مسلمان سیاسی پالکی کے کہار بننے کے بجائے خود اس میں اپنے لئے جگہ بنائیں - بقیہ - مطالعاتی و معاہداتی سیاست

بنیادی مقصد یہی اور صرف یہی ہے کہ بی جے پی کو اقتدار میں نہ آنے دیا جائے۔ ان ریاستوں میں جہاں دوسری پارٹیاں کمزور ہیں اور کانگریس کسی بھی درجے میں طاقتور ہے، کانگریس کی حمایت کا جواز از خود پیدا ہوجاتا ہے۔ اس ضمن میں راجستھان، مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش جیسی ریاستوں کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

وہ لوگ جو بی جے پی کی مخالفت کو ہی مسلمانوں کا بنیادی مقصد قرار دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں ان میں سے بیشتر کے دلوں میں کہیں نہ کہیں یہ خیال موجود ہے کہ اس کے سہارے ہی مسلمانوں کو اگر پورے ملک میں نہیں تو چند ریاستوں میں ہی سہی ایک بار پھر ہانک کر کانگریس کے باڑے میں پہنچایا جاسکتا ہے۔ یہ لوگ دراصل نہ مسلمانوں کے ہمدرد ہیں نہ انہیں جمہوریت اور سیکولرزم سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ انہیں فرقہ پرستی سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ یہ اپنی غرض کے بندے ہیں اور اپنی غرض کے لئے کچھ بھی کرسکتے ہیں کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں اور کچھ بہت زیادہ مخلص یا مسلمانوں کے ہمدرد وہ لوگ بھی نہیں ہیں جو ان کے سامنے فرقہ پرستی کا ہوا کھڑا کرکے انہیں نام نہاد سیکولر پارٹیوں کے باڑے میں ہانک لے جانا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی سوچ بھی منفی ہے۔ وہ جو کچھ چاہتے ہیں وہ صرف یہی ہے کہ بی جے پی اقتدار میں نہ آنے پائے اور سب سے زیادہ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس گروہ میں وہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو یہ کہتے کبھی نہیں تھکتے کہ مسلمان تو ایک اصول پسند گروہ ہے اور وہ منفی نہیں بلکہ مثبت مقاصد پر یقین رکھتا ہے

مسلمان چاہے کانگریس کو ووٹ دیں چاہے اپنے آپ کو سیکولر اور جمہوریت پسند کہنے والی پارٹیوں کی تاکید حمایت کریں ان کے حصے میں محرومی اور مایوسی کے سوا کچھ اور آنے والا نہیں ہے۔ اور آ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ مطالباتی یا معاہداتی سیاست سے کچھ انہی کو مل سکتا ہے جو فریق ثانی کو اپنے مطالبات پر یا متعلقہ معاہدے پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں اور کسی جمہوری ملک، کسی گروہ کے اندر یہ قوت اس کے ووٹ کے نتیجے میں ہی پیدا ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے ووٹ اپنے لئے استعمال کرنے اور اپنے ووٹ کی طاقت کو دوسروں کے بجائے خود اپنے آپ کو اقتدار میں حصہ دار بننے کے لئے استعمال کرلے۔ جو لوگ اپنے بارے میں یہ طے کرلیں کہ انہیں فلاں یا فلاں کو مسند اقتدار پر بٹھانا ہے تو وہ شریک مملکت یا شریک سلطنت اور برابر کے شہری کا مقام حاصل نہیں کرسکتے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بنیادی طور پر یہ طے کرنا ہے کہ وہ سیاست کی پالکی کا کہار بننے کے بجائے خود اس پالکی میں اپنے لئے جگہ بنانے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کل ہند سطح کی ان کی کوئی اپنی سیاسی تنظیم ہو اور وہ دوسروں کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے اور پارلیمنٹ و اسمبلیوں میں اپنے امیدوار کو پہنچانے کی کوشش کریں۔ کل ہند سطح کی پارٹی دوسری پارٹیوں سے برابری کی سطح پر سمجھوتہ بھی کرسکتی ہے اور متعلقہ پارٹی اگر ان سمجھوتوں پر دیانتداری سے عمل نہ کرے تو اسے اس کا مزا بھی چکھا سکتی ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ کیرلا کے تجربے کو پورے ملک تک وسیع کردیا جائے۔ جمہوری ہندوستان میں باعزت زندگی پروقار زندگی گزارنے کا یہی دارومدار راستہ ہے۔ باقی جو دوسرے راستے ہیں ان پر چل کر مسلمانوں کا تو بھلا ہونے والا نہیں ہے ہاں ان کے ووٹوں کے اصلی نقلی ٹھیکیداروں کا بھلا ضرور ہوجائے گا۔ اقتدار کے دسترخوان سے پھینکی ہوئی کچھ ہڈیاں ان کے حصے میں پہلے بھی آتی رہی ہیں اور اب بھی آجائیں گی۔ مسلمان پہلے بھی پریشان حال تھے اور اب بھی پریشان حال رہیں گے۔

> کل ہند سطح کی پارٹی دوسری پارٹیوں سے برابری کی سطح پر سمجھوتہ بھی کرسکتی ہے اور متعلقہ پارٹی اگر ان سمجھوتوں پر دیانتداری سے عمل نہ کرے تو اسے اس کا مزا بھی چکھا سکتی ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ کیرلا کے تجربے کو پورے ملک تک وسیع کردیا جائے۔

فکری یورشوں کے اس دور میں مومن کی شخصیت کی تعمیر

حب الٰہی اور حب رسول کے سہارے ہم تمام تر گمراہیوں سے نکل سکتے ہیں

ملت اسلامیہ کی باعظمت تاریخ ایسے حوادث و واقعات سے بھری پڑی ہے جو ہمارے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ ان پر غور وفکر کیا جائے اور ان کی معنویت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ وہ روشن تاریخ ہے جس کا رشتہ آج کے زمانے سے جوڑنے کی حد درجہ ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اس کی وقعت و عظمت کی اساس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر امت اسلامیہ کا عمل ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور اخلاق اور طریقہ زندگی کو مشعل راہ بنانے میں بڑی خیر و برکت ہے اس لئے کہ اس سے انسانی شعور کو نہ صرف رفعت و بلندی حاصل ہوتی ہے بلکہ اللہ کی محبت اور اس سے قربت کی وقعت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اللہ سے محبت کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ ان کے مقابلے میں بندے کو دنیا کی کوئی دوسری شے عزیز نہ ہو۔ اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے الفت اتنی ہو کہ اس سے زیادہ نہ مال و متاع سے ہو نہ اولاد سے اور نہ اپنے آپ سے۔ اب سوال یہ ہے کہ حب الٰہی اور حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا شدید و عمیق جذبہ جگانے کا کیا طریقہ ہو۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جمادات و حیوانات اور عقل و ذہن سے عاری مخلوقات میں بھی اللہ نے حب رسول صلعم کا جذبہ ودیعت کیا ہے تو انسان کو بھلا اس جذبے سے وہ کیونکر محروم رکھ سکتا ہے جب کہ ہمیں تو اللہ نے اکمل صورت پر بنایا ہے اور احسن تقویم کا مرتبہ عطا کیا ہے اور اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمیں نور ہدایت کی دولت سے سرفراز کیا ہے۔ پیغمبر اسلام کو خاتم النبیین کا مرتبہ بخش کر اللہ تعالیٰ کو خود حب رسول کا اظہار مقصود تھا۔ اسی لئے ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کا حکم ہوا اور یہ وضاحت کی گئی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا راز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی اتباع میں ہے۔ ایسی ہستی کی اتباع جسے اللہ نے "خیر خلقہ اجمعین" بنایا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب اخلاق کو اپنی زندگیوں سے مربوط کرنے کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ اپنی اس نسل کو جو ابھی بلوغ کے مرحلے میں داخل ہونے والی ہے اوصاف رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف کرائیں کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اللہ نے خود اپنے لئے محبت کی شرط قرار دیا۔ کوئی مسلمان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے حد درجہ تعلق خاطر کی بہتر مثال اگر پیش کر سکتا ہے تو اسی طرح کہ خود کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا آئینہ اور اطاعت رسول کو اپنا شعار بنائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں کہ:

واطیعوا اللہ والرسول لعلکم ترحمون (سورہ آل عمران) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بندے کے لئے رحمت خداوندی کے حصول کا ذریعہ تنہا اللہ کی ذات سے محبت ہی نہیں ہے بلکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور قول و فعل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع بھی ضروری ہے۔

سنت نبوی کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کی ضرورت خصوصاً اس دور میں زیادہ ہے جب امت اسلامیہ طرح طرح کے فتنوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہے۔ اس پر مختلف بہانوں سے فکری یورشیں ہورہی ہیں جن کا مقصد اسے صحیح راستے سے بھٹکانا ہے۔ تشکیک اور بداعتقادی اپنی مختلف شکلوں میں اس امت کے ارادے کو متزلزل کررہی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ آئے دن ایسے گروہ پیدا ہورہے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات و احکامات کو ہیچ اور ناقابل التفات سمجھتے ہیں۔ زمانے کی برق رفتاری نے خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام سے بیگانہ کیا ہے لیکن اس کی ذمہ داری ایسے لوگوں پر ہے جو اس نسل کو پروان چڑھانے والے ہیں۔ یہ سوچنا ان کا کام ہے کہ وہ اس نسل کو ابتری اور لادینی کی طرف لے جائیں گے یا اسے نظم و سکون اور دنیا و آخرت کی کامیابی سے ہمکنار کریں گے۔ ●

دو مذہب کے ماننے والے ایک دوسرے کی جائیداد کے وارث نہیں بن سکتے

فقہی سوال اور ان کے جواب

سوال:۔۔۔ دو بھائیوں نے اپنی ایک قیمتی مشترکہ جائداد کو جب بیچنے کا فیصلہ کیا تو بڑے بھائی نے چھوٹے کو اپنے حصے کی زمین کا بھی سودا کرلینے کا مختار بنادیا اس امید پر کہ جب وہ بک جائے گی تو اسے حاصل شدہ قیمت میں سے آدھا حصہ مل جائے گا۔ جب بڑا بھائی ایک سال بعد گھر واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ جائداد تو بک چکی ہے اور چھوٹے بھائی نے قیمت میں سے آدھا حصہ بھی لے لیا ہے البتہ اس جائداد کے مالکانہ حقوق خریدار کے نام منتقل نہیں ہوئے ہیں۔ اس طرح دو سال کا عرصہ گزر گیا لیکن بڑے بھائی کو قیمت میں سے کوئی بھی رقم نہیں ملی۔ اور جیسا کہ دونوں میں معاہدہ ہوا تھا۔ بھائیوں میں سے کوئی بھی اس جائداد کو اپنے مصرف میں نہیں لے سکتا جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دوران اس سے حاصل ہوسکنے والے کرائے کا بھی نقصان ہوا۔ بڑے بھائی نے یہ تجویز رکھی ہے کہ جائداد کی موجودہ شرح کے اعتبار سے دوبارہ قیمت مقرر کی جائے تاکہ اس کے حصے کی رقم کی ادائیگی میں تاخیر سے ہونے والے نقصان کی تلافی ہوسکے کیا یہ تجویز قابل قبول ہے۔

جواب:۔۔۔ سائل کو اصلاً اس بات سے سروکار ہونا چاہئے کہ جائداد کی فروخت سے حاصل شدہ رقم میں سے اس کا مقررہ حصہ اسے مل جائے چونکہ مشترکہ جائداد کو بیچنے کا فیصلہ اسی شرط پر ہوا تھا۔ یہ ضرور حیرت کی بات ہے کہ چھوٹے بھائی نے خریدار سے حاصل شدہ پوری رقم اپنے پاس رکھ لی اور اس میں سے کچھ بھی بڑے بھائی کو نہ دیا جب کہ وہ نصف جائداد کا یکساں مالک ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خریدار نے آدھی قیمت پہلے ادا کی ہے اور بقیہ آدھی کی ادائیگی کے لئے مہلت طلب کی ہے اور اس بات پر بیچنے اور خریدنے والے میں کوئی معاہدہ ضرور ہوا ہوگا۔ خرابی یہ پیدا ہوگئی ہے کہ بڑا بھائی رقم کا کوئی حصہ پائے بغیر جائداد کو مصرف میں لینے کے حق سے محروم ہوگیا اور معاہدہ بیع کا پابند بھی ہوگیا۔ اس زیادتی کی پوری ذمہ داری چھوٹے بھائی پر ہے جس نے بڑے بھائی کے مفاد کا خیال نہ رکھا۔ تاہم یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کہ ایسا لاپروائی کی وجہ سے ہوا۔

حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ چھوٹے بھائی کی نیت میں کھوٹ نہیں ہے کیونکہ اس نے مشتری کے نام مالکانہ حقوق منتقل نہیں کئے ہیں۔ اس نے صرف اپنے مفاد کو ضرور مقدم رکھا ہے اور نصف رقم جو خریدار سے وصول ہوئی اس نے وہ پوری خود لے لی۔ اسے مقررہ مدت پر خریدار سے باقی رقم مل جانے کی بھی امید رہی ہوگی۔ اس نے اپنی فوری ضرورت کے پیش نظر نصف رقم اپنے استعمال میں لے لی۔

اب چھوٹے بھائی کو چاہئے کہ حاصل شدہ رقم کا نصف حصہ بڑے بھائی کو دے دے اور باقی رقم کا تقاضہ خریدار سے دونوں مل کر کریں جب وہ مل جائے تو اس میں سے بھی آدھا آدھا بانٹ لیں۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ دونوں کے ایک ساتھ تقاضہ کرنے کا اثر خریدار پر زیادہ پڑے گا۔

جائداد کی قیمت دوبارہ متعین کرنے کا مشورہ یہاں نہیں دیا جاسکتا کیونکہ تاخیر سے ادائیگی کے باعث زیادہ پیسے حاصل کرنے کا اسے ایک طریقہ بنالیا جاسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ خریدار سے جلد از جلد حساب بے باق کرنے کا تقاضا کیا جائے اور اسے ایک متعین تاریخ دے دی جائے کہ اس کے بعد اس کی ادا شدہ جزوی رقم واپس دے کر جائداد واپس لے لی جائے گی۔ اس کے بعد ہی اس کی بازار کی موجودہ شرح کے مطابق نئی قیمت مقرر کی جاسکتی ہے۔

ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ خریدار اور بڑا بھائی جائداد کے مشترک مالکان بن جائیں اور بڑا بھائی اپنا حصہ اس خریدار کو یا کسی اور کو فروخت کرے اس کو اگر وہی خریدار چاہے تو بڑے بھائی کی شرائط کے مطابق اس سے سودا کرلے۔ ورنہ یہی راستہ رہ جاتا ہے کہ باقی نصف رقم کی معینہ مدت کے اندر ادائیگی کا مطالبہ کیا جائے اور ایسا نہ ہونے پر معاہدہ فروخت کو کالعدم کرکے نصف رقم واپس کرکے جائداد دونوں بھائیوں کی تحویل میں آجائے۔

سوال:۔۔۔ ایک شخص کے غیر مسلم باپ کا انتقال ہوا تو مرنے والے کی جائداد کے مسئلے پر قانونی جنگ شروع ہوگئی۔ اس شخص کی دو بہنیں بھائی اور وہ خود اس سوتیلی بہن سے باپ کی جائداد میں حق پانے کے لئے لڑ رہے ہیں جو غیر مسلم باپ کی مشترک قانونی بیوی ہے۔ وضاحت طلب بات یہ ہے کہ اگر عدالت ان لوگوں کو جائداد کا وارث قرار دیتی ہے تو شخص مذکور اس میں سے اپنا حصہ لے یا اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو دے دے یا ضرورت مند مسلمانوں میں تقسیم کردے۔؟

جواب:۔۔۔ عام حکم تو یہ ہے کہ دو مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کی جائداد کے وارث نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی غیر مسلم کو کسی مسلمان کی جائداد میں سے حصہ نہیں ملے گا اور نہ مسلمان کو غیر مسلم کی جائداد میں سے۔ تاہم امام ابن تیمیہ نے یہ مضبوط موقف اختیار کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان اپنے غیر مسلم عزیز کی جائداد کا وارث ہوسکتا ہے۔ انہوں نے یہ رائے اخذ کرنے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استناد کیا ہے کہ مسلمان تو غیر مسلم رشتے دار کی جائداد کا وارث ہوسکتا ہے لیکن غیر مسلم شخص اپنے مسلمان رشتے دار کی جائداد کا وارث نہیں ہوسکتا۔ یہ رائے بڑی مضبوط بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ عموماً غیر مسلم حضرات وصیت کرجاتے ہیں کہ ان کی جائداد کا وارث کون کون ہوگا۔ گویا کہ قریب المرگ شخص خود یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے بعد اس کی جائداد کن لوگوں میں تقسیم ہوگی۔ بہت سے غیر مسلم ممالک میں اب ایسے قانون بن گئے ہیں جن کی روشنی میں یہ تعین کیا جاتا ہے کہ جو شخص بغیر وصیت کئے ہوئے فوت ہوجائے اس کی جائداد کس طرح تقسیم ہوگی۔ اس لئے اگر کسی مسلمان کو کسی وصیت یا کسی قانون وراثت کی رو سے ترکے میں حصہ یا کوئی رقم مل رہی ہے تو ابن تیمیہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے کے مطابق وہ اسے لے سکتا ہے۔ ●

دودھ پلانے کے بارے میں مائیں غلط فہمی کی شکار کیوں ہیں

ماں کے دودھ پر پلنے والے بچے زیادہ ذہین ہوتے ہیں

بچوں کو اپنا دودھ پلانے کے سلسلے میں بعض مائیں بیجا اندیشوں میں بستلا رہتی ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بحیثیت ماں کے اپنے جسم کے اعضاء اور ان کے افعال کی اہمیت سے پوری طرح واقف نہیں ہوتیں۔ عموما انہیں یہ تشویش لاحق رہتی ہے کہ ان کے بچے کو بار بار بھوک لگتی ہے، ان کا دودھ پورا نہیں پڑتا اور انہیں زیادہ دودھ اترنا چاہئے، اور یہ کہ بچوں کو دودھ پلانے سے ان کے جسم کی کشش ختم ہوجائے گی وغیرہ۔ بیشتر ماؤں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے اسی طرح کے سوالات کا جواب یہ ہے کہ ماں کا دودھ پینے والے بچوں کو بار بار بھوک لگنے کا سبب یہ ہے کہ ماں کا دودھ تیزی سے ہضم ہوتا ہے۔ دودھ کی مقدار بڑھانے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ بچے کو وقفے وقفے سے دودھ پینے کا موقع دیا جائے۔ جسم کی کشش ختم ہوجانے کے تعلق سے بھی عورتوں میں غلط فہمیاں ہیں۔

اگر ماؤں کو حقائق سے آگاہی نہ ہو تو انہیں ایک طرح کے جرم کا احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو بھرپیٹ دودھ بھی نہیں پلاسکتیں اور پھر اس مسئلہ کا یہی حل نکالا جاتا ہے کہ ڈبے کا دودھ لایا جائے اور بوتل سے بچے کو پلایا جائے حالانکہ ماں کا دودھ تمام آلودگیوں سے پاک ہوتا ہے

کسی بھی بازاری فارمولا کے مقابلے میں ماں کے دودھ کی کئی درجہ زیادہ افادیت عورتوں کو ذہن نشین کرانے میں اسپتال کا عملہ نمایاں کردار ادا کرسکتا ہے۔ اس بارے میں ضروری ہدایات انہیں پہلے سے اسی وقت مل جانی چاہئیں جب وہ نئے مہمان کی آمد کی تیاریاں کررہی ہوں۔ وہ مائیں جو دودھ پلانے کے نئے تجربے سے دوچار ہونے والی ہوں ان کے ذہن سے تمام غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔ انہیں یہ بتایا جانا چاہئے کہ اپنے دودھ کے بچے کے لئے ناکافی ہونے کے احساس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بچے کے معدے میں سے آنتوں تک تیزی سے پہنچتا ہے اس کے مقابلے میں ڈبے کا دودھ اس عمل سے گزرنے میں زیادہ وقت لیتا ہے اسی لئے بچے کو دودھ کی ضرورت لمبے وقفے پر ہوتی ہے جس سے یہ تاثر قائم کیا جاتا ہے کہ بچہ ڈبے کا دودھ پی کر زیادہ طمانیت محسوس کرتا ہے۔ یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ ماں کا دودھ بچے کے لئے کافی ہورہا ہے ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ دیکھنا یہ چاہئے کہ بچہ دن میں چھ بار پیشاب کرتا ہے یا نہیں۔

ولادت کے فورا بعد بھی بعض ماؤں کو دودھ پلانے میں دشواری محسوس ہوتی ہے اس میں بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ دودھ دوران ولادت کے تین دن بعد شروع ہوتا ہے لیکن ولادت کے ایک گھنٹے بعد سے ہی یہ عمل بچے کو شروع کرایا جاسکتا ہے۔ بالکل ابتداء میں پہلاہٹ لئے ہوئے جو دودھ خارج ہوتا ہے اسے کولوسٹرم کہتے ہیں جو زود ہضم اور ایسے مادوں پر مشتمل ہوتا ہے جو آئندہ آلودگی، جلدی امراض اور دمے سے بچے کی مدافعت کرتے ہیں۔

ابتدائی مرحلے میں ماؤں سے یہ غلطی ہوجاتی ہے کہ بچوں کو دودھ سے پہلے شہد یا شکر ملا ہوا پانی

> ابتدائی مرحلے میں ماؤں سے یہ غلطی ہو جاتی ہے کہ دودھ سے پہلے شکر یا شہد ملا ہوا پانی پلادیتی ہیں جس سے بچے کی بھوک مٹ جاتی ہے اور وہ چھاتی سے دودھ پینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

پلادیتی ہیں جس سے بچے کی بھوک مٹ جاتی ہے اور وہ چھاتی سے دودھ پینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس صورت حال سے بھی ماں کی چھاتی میں پورا دودھ نہیں اتر پاتا۔ چھاتی کے سائز اور ماں کی خوراک کا بھی دودھ کی پیداوار سے تعلق نہیں ہے۔ چھاتی کا سائز روغن دار خلیوں سے ہے جبکہ دودھ میمری گلینڈ سے خارج ہوتا ہے جو ہر عورت کے جسم میں ہوتے ہیں۔ بچہ جب چھاتیوں کو چوستا ہے تو ان غدود میں تحریک ہوتی ہے۔ اس لئے دودھ پلانے کے دوران عورت جو چاہے کھائے پئے اس سے کوئی فرق واضح نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اگر ماں پابندی سے بعض دوائیں استعمال کررہی ہے تو بھی وہ بچے کو دودھ پلاسکتی ہے صرف دو حالتوں میں دودھ پلایا نہیں جاسکتا جب عورت ریڈیو تھراپی اور کینسر کے لئے کیمو تھراپی سے گزر رہی ہو۔ ڈاکٹروں کا دعوی ہے کہ ملیریا، ٹائی فائڈ، یرقان اور جذام جیسے امراض میں دودھ پلانے کا عمل جاری رکھا جاسکتا ہے اور بچے کو کوئی زد نہیں پہنچتی۔

طبی تحقیقات کے مطابق ماں کے دودھ پر پلے ہوئے بچے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ذہین ثابت ہوتے ہیں اسی طرح ان بچیوں کو جن کی ماؤں نے انہیں اپنا دودھ پلایا بڑی ہوکر چھاتی کے کینسر کا خطرہ انہیں اپنی دوسری ہم عمروں کے مقابلے میں خاصا کم ہے۔ مجموعی طور پر ماں کے دودھ پر پلنے والے بچوں میں کینسر کا خطرہ تیس فیصد کم ہوتا ہوا پایا گیا ہے۔ نیز یہ کہ دودھ پلانے والی عورتوں کو دوسری عورتوں کے مقابلے میں چھاتی اور رحم کے کینسر کا خطرہ کم لاحق رہتا ہے۔

آرسینک ملا ہوا پانی کینسر اور جلدی امراض کا سبب بنتا ہے

کسی خطے میں زیرزمین پانی کی آرسینک سے آلودگی کا تعلق اس کی ارضیاتی خصوصیات سے ہے یا یہ انسانی ہاتھ کا کرشمہ ہے اس بحث کا فیصلہ کرنے کے لئے پوری چھان بین سے جمع شدہ معلومات کی فراہمی ضروری ہے خصوصا جب کہ مغربی بنگال کے کئی اضلاع میں زیر زمین پانی کی آرسینک سے آلودگی حال ہی میں اخبارات کا اہم موضوع بن رہی ہے۔ بہت سے بین الاقوامی شہرت کے ماہرین نے متاثرہ علاقوں کا معائنہ کرنے کے بعد آرسینک سے پیدا ہونے والے خطرے کو چرنوبل کی تباہ کاری سے مماثل قرار دیا ہے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نتائج نامکمل اور ناقص معلومات کی بناء پر اخذ کئے گئے ہیں اور اس کا بھی امکان ہے کہ اس کا مقصد اخباری دنیا میں سنسنی پھیلا کر غیر اہم واقعات کو اچھالنے کی خواہش کی تسکین ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی کی آرسینک آلودگی سے متعلق موقر جرائد میں شائع تحقیق پر مبنی تحریروں کا فقدان ہے اور گذشتہ ایک دہائی سے اس میدان میں ہونے والی تحقیق کا معروضی جائزہ لینا مشکل ہورہا ہے۔

آرسینک ایک مہلک نیم دھاتی مادہ ہے جس کی ہوا اور پانی میں آمیزش انسانی نظام نبض کو متاثر کرتی ہے اور طرح طرح کی جلدی خرابیوں اور

> آرسینک ایک مہلک نیم دھاتی مادہ ہے جس کی ہوا اور پانی میں آمیزش انسانی نظام نبض کو متاثر کرتی ہے اور طرح طرح کی جلدی خرابیوں اور کینسر کا سبب بنتی ہے۔

کینسر کا سبب بنتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر نامیاتی آرسینک آنتوں کی سوزش اور قلب کی شریانوں جیسے عارضے بھی اس سے ہوسکتے ہیں۔

عالمی سطح پر اگر جائزہ لیا جائے تو آرسینک کی مجموعی مقدار کا دو تہائی حصہ لکڑی کی صنعت میں پلائی ووڈ بنانے اور اس کے تحفظ میں استعمال ہوتا ہے۔ 23 فیصد حصہ ایسی جراثیم کش دواؤں کی تیاری میں کام آتا ہے جو فصلوں کو تباہی سے بچاتی ہیں۔ اگر اس مفروضہ کو تحقیقات کی بنیاد بنایا جائے کہ آرسینک سے پیدا شدہ خطرہ انسان کا کھڑا کیا ہوا نہیں ہے تو اس طرف بھی نگاہ رکھنی ضروری ہے کہ گذشتہ پچاس سالوں میں پلائی ووڈ انڈسٹری اور جراثیم کش ادویات کی صنعت کو کافی وسعت ملی ہے اور اس کے ساتھ آرسینک سے اثر پذیری کے امکانات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

اس خطرے کے اضافے میں انسانی ہاتھوں کے ملوث ہونے کا ایک اشارہ اس بات سے بھی ملتا ہے کہ آرسینک میں مخصوص معدن آرسینو پائی رائٹ قدرتی حالت میں شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ پانی میں بہت تیزی سے حل ہوتا ہے اس لئے آرسینک مٹی کے ذرات میں جذب ہوجاتا اور چٹانوں میں چپکے ہوئے نامیاتی فضلے کا حصہ بن جاتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ زیر زمین پانی میں آرسینک کی موجودگی کا جائزہ لیتے وقت متعلقہ خطے کی مٹی کے ذرات میں موجود نامیاتی مواد کی مقدار و تناسب کو ملحوظ رکھا جائے۔

آرسینک کے مہلک اثرات کی نشاندہی سب سے پہلے حکومت مغربی بنگال کی تشکیل کردہ ایک کمیٹی کی رپورٹ سے ہوئی جس نے 1978ء میں بتایا کہ ریاست کے بعض علاقوں میں اس سے متاثر ہونے کے واقعات پیش آئے ہیں اور وہاں اسکول آف ٹراپیکل میڈیسن کے جلدی امراض کے شعبے نے بھی اس کی تصدیق کردی جس کے مطابق 1993ء میں 47 گاؤوں سے موصول ایک ہزار سے زائد افراد میں آرسینک کے زیر اثر ہتھیلی اور تلووں پر چھچنے کے نشانات ابھر آئے تھے۔ اس مسئلہ پر تحقیق کرنے کے لئے کئی دیگر ادارے بھی آگے آئے ان میں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف ہائی جینک اینڈ پبلک ہیلتھ، پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ (مغربی بنگال)، اسٹیٹ واٹر انوسٹی گیشن ڈپارٹمنٹ، سنٹرل گراؤنڈ واٹر بورڈ اور جیولوجیکل سروے آف انڈیا قابل ذکر ہیں۔

اخبارات میں وقتا فوقتا شائع ہونے والے مضامین اور رپورٹوں میں جن میں جادو پور یونیورسٹی کا انسٹی ٹیوٹ آف انوائرنمنٹل اسٹڈیز سر فہرست ہے یہ بات کہی گئی ہے کہ حالیہ ترین اعداد و شمار کے مطابق 34 344 مربع کلو میٹر کا رقبہ آرسینک کی زد میں ہے جس میں آباد 276 749 30 افراد اس کے ہلاکت خیز اثرات کا شکار ہورہے ہیں اور آرسینک کی سمیت کو آہستہ آہستہ اپنے جسموں میں جذب کرتے جارہے ہیں۔ نیز یہ کہ اس شرح میں ہر سال متاثر رقبے اور افراد دونوں میں 20 فیصد کا اضافہ ہورہا ہے۔

بھگوان گڈوانی کا کہنا ہے کہ آریہ باہری نہیں ہندستانی ہی تھے

افسانوی باتوں کو تاریخی حقائق کے روبرو کھڑا کرنے کی کوشش

بازار میں ہاتھوں ہاتھ بکنے والے ناول "دی سورڈ آف ٹیپو سلطان" (جسے سلسلے وار دوردرشن پر بھی پیش کیا جاچکا ہے) کے مصنف بھگوان ایس گڈوانی تقریبا ڈیڑھ سال سے دیس بدیس کی لائبریریوں اور میوزیموں سے غیر تحریری اور عوام کی یاد داشت میں محفوظ گیت اور نغمے جمع کرنے میں مصروف ہیں جن سے آریوں کے عہد اور طرز زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہو۔ گڈوانی کا خیال ہے کہ آریوں کا آغاز اسی سرزمین پر ہوا تھا۔ انہیں ایسے تاریخ دانوں سے اختلاف ہے جو آریوں کے ہندوستان میں باہر سے ورود کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ کناڈا میں مقیم گڈوانی حال ہی میں پنگوئن کی شائع کردہ اپنی تازہ ترین تصنیف "دی رٹرن آف دی آریئز" کے ساتھ دہلی آئے ہیں۔

اس کتاب کے ابتدائی تقریبا سو صفحات کے مواد سے ایک اور تنازعہ کھڑا ہوسکتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ گڈوانی جیتے ہی اسی بل بوتے پر ہیں۔ "دی سورڈ آف ٹیپو سلطان" میں ٹیپو کا جو کردار انہوں نے پیش کیا تھا اس پر بھی اختلافات ابھرے تھے۔ ہر شخص نے یہی کہا کہ گڈوانی نے ٹیپو سلطان کو ہندو نواز حکمراں کے طور پر پیش کیا ہے جس کے دربار میں ہندو وزراء کی بھرمار تھی اور جو مندروں کو دل کھول کر دان دیتا تھا۔ ان لوگوں کے مطابق حقیقت یہ تھی کہ ٹیپو کے دور حکومت میں بہت سے ہندوؤں کو جبرا مسلمان کیا گیا۔ اس کے جواب میں گڈوانی نے بس اتنا کہا کہ اس طرح کے واقعات دوردراز کے علاقوں میں ہوتے تھے۔ ٹیپو کے دربار میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔

"رٹرن آف دی آریئز" سے جو تنازعہ پیدا ہوسکتا ہے اس میں گڈوانی کا پیش کردہ یہ نظریہ ہے کہ آریوں کا آغاز ہندوستان کے اندر سے ہی ہوا تھا۔ ان کا دعوی ہے کہ بہت سے آریائی ایسے بہتر مقامات کی تلاش میں دیگر علاقوں کی طرف کوچ کرگئے تھے جو بد عنوانی، تشدد اور برائیوں سے پاک ہوں۔ نہ وہ مال و دولت کے متلاشی تھے نہ ہی مذہبی رہنما یا مجاہد تھے اس لئے جب اجنبی علاقوں میں جاکر بھی ان کی (سکون سے رہنے) کی تمنا پوری نہ ہوئی تو وہ جلد ہی واپس لوٹ آئے۔ ان میں سے جو نسبتا کم عمر کے افراد تھے باہر کے علاقوں میں زیادہ دنوں تک آباد رہے اور وہیں ان کی نسل آگے بڑھی۔

جب وہ "بھارت ورش" واپس آئے تو ان کے ساتھ نہ صرف ان کے خاندان کے افراد تھے بلکہ بعض مقامی افراد بھی تھے جنہوں نے آریوں سے مادر وطن کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ مختلف ممالک کے مقامی افراد واپس ہوتے ہوئے آریوں کے ساتھ ہولئے۔ جن ممالک میں آریہ قوم کے لوگ جاکر آباد ہوئے ان کی تعداد 22 ہے ان میں ایران، مصر، فن لینڈ، لتھوانیا، ترکی، جرمنی، اسپین اور یونان شامل ہیں۔ بعض گروہ مشرق کی طرف بھی بڑھے اور بالی، جاوا اور ملیشیا پہنچے۔ بھارت ورش سے آریائی لوگ جہاں جہاں بھی
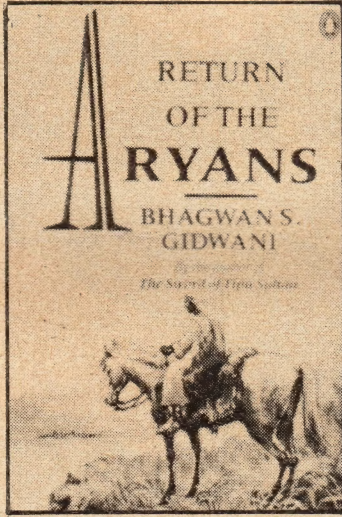
گئے وہاں اپنی زبان یعنی سنسکرت کے اثرات اور ثقافتی، سماجی اور روحانی نقوش چھوڑتے چلے گئے۔

آریوں کی ہند میں باہر سے آمد کے نظریے کی حمایت کرنے والے مورخین کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سنسکرت زبان یونانی اور لاطینی اور ہند آریائی اور ہند یوروپی خاندان السنہ بڑی مشابہت رکھتی ہے۔ موخرالذکر خاندان میں گوتھک، آرمینی، البانی اور لتھوانی شامل ہیں۔ ان سب نے سنسکرت سے استفادہ کیا ہے۔

گڈوانی اور دیگر تاریخ نگاروں کے درمیان نقطہ اختلاف رگ وید لکھے جانے کی تاریخ ہے۔ بیشتر مورخین اسے 1000 یا 1500 قبل مسیح کی تصنیف قرار دیتے ہیں جب کہ گڈوانی کا دعوی ہے کہ یہ 4000 قبل مسیح میں لکھی گئی۔ وہ ہندوستانی تہذیب کا وجود 8000 قبل مسیح سے پہلے ثابت کرتے ہیں اور زمانہ قبل از تاریخ کے ہندوستان کے آرٹ، ثقافت، جمالیات، موسیقی اور روحانی اقدار کی جھلک بھی پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ کتاب قارئین کے وسیع حلقے تک پہنچنے کی غرض سے ناول کے طرز پر لکھی گئی ہے تاہم جناب گڈوانی کا کہنا ہے کہ اس میں کذب بیانی، قیاس آرائی سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ یہ کام قدیم سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والے نغمات اور آثار قدیمہ کے ریکارڈوں کے ماخذ کی تحقیق پر مبنی ہے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ آریوں نے دیگر ممالک میں اپنے اثرات چھوڑے انہوں نے اوم، نمستے، سواستکا اور سوم جیسے کئی الفاظ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک میں مستعمل ہیں۔ گڈوانی کا خیال ہے کہ عہد قبل از تاریخ میں بھی ہندو پارلیمنٹ اور عدلیہ کا وجود تھا۔ اس کے علاوہ بندرگاہوں، جہاز سازی، طب، فن تعمیر، موسیقی، رقص، علم نجوم کے باقاعدہ ادارے تھے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ قبل از قدیم دور کا ہندو ازم اور اس کے فکر و فلسفہ سے بیرونی اقوام ہندوستانیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ باخبر تھیں۔ گڈوانی یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ڈیڑھ سال سے زائد عرصہ جو انہوں نے ماخذ کی تلاش میں اسی خیال کے تحت صرف کیا ہے کہ موجودہ نسل کا قدیم ہندوستانی ثقافت کی جڑوں سے رشتہ منقطع ہوتا جارہا ہے۔ اور جو نسل اپنی اصل سے بے خبر رہتی ہے وہ ختم ہوکر رہ جاتی ہے۔ پہلے ہی ہم تہذیبی تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں جس میں ہمارے بچے کہیں زیادہ ذہانت کے مالک ہوں گے لیکن بصیرت اور روحانی عظمت سے محروم ہوں گے۔

اس طرح گڈوانی نے بزعم خود قدیم ہندوستانیوں کی حقیقی تصویر پیش کی ہے وہ سب مجاہد اور مہاتما نہیں تھے ان میں سے بعض آج کے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بد عنوانی کا شکار تھے۔ مختصرا یہ کہا جاسکتا ہے کہ قدیم تر زمانے کے ہندوؤں کا عقیدہ توہمات سے پاک تھا کرم اور

باقی ص 6 پر

آپ کی الجھنیں

وہ حلال میں حرام کی آمیزش کرتا ہے اور پھر لوگوں کو دعوت پر بلاکر اسے جائز کرنا چاہتا ہے

سوال: — میں اپنے ایک قریبی عزیز کے ذریعہ معاش کے حلال ہونے سے مطمئن نہیں ہوں۔ اس کی حلال کی آمدنی میں حرام کی ملاوٹ ہوتی رہتی ہے اور بعض موقعوں پر کسی بہانے سے کوئی محفل کرکے وہ لوگوں کو کھانے پر بلاتا ہے۔ میں ایسے موقعوں پر وہاں جانے سے احتراز اور قیل و قال کرتا ہوں تو میرے والدین ناراض ہوتے ہیں اور والد صاحب یہ مثال پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے یہاں بھی کھانا تناول فرمایا تھا جب کہ سود خوری یہودیوں کے یہاں عام ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے صحیح صورت حال سے آگاہ فرمائیں؟

جواب: — خاص موقعوں پر مثلا شادی بیاہ وغیرہ کی تقریب یا کسی تہوار کے موقع پر عزیزوں کی دی ہوئی دعوت قبول کرنا سنت موکدہ ہے کیونکہ یہ عمل آپس میں محبت کو بڑھاتا ہے اور ایک دوسرے کے تئیں دلوں کو صاف اور کشادہ کرتا ہے اور جیسا کہ بخاری میں مذکور ہے شادی کے موقع پر دعوت میں شرکت کرنا واجب ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمہیں ولیمہ پر بلایا جائے تو ضرور جاؤ۔ ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ جو دعوت ولیمہ میں شرکت نہیں کرتا وہ گویا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک گنہگار ہے۔ زبان کے ماہرین کے مطابق ولیمہ شادی کا مخصوص کھانا ہے۔ اور اگر ولیمہ پر بلانے والا شخص منکرات کا ارتکاب کرتا ہو یا ظالم فاسق اور بدعات کا عادی ہو یا اس کی کمائی پاک نہ ہو تو ایسی صورت میں دعوت میں شرکت کا وجوب ساقط ہوجاتا ہے۔ اس طرح اگر یہ معلوم ہوجائے کہ جس کھانے پر بلایا جارہا ہے وہ حرام ہے تو دعوت قبول کرنا جائز نہیں۔ چوری کی ہوئی یا کسی سے چھینی ہوئی بکری کے گوشت میں شرکت کا بھی یہی حکم ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم نہ ہو کہ جو کچھ کھانے کے لئے بلایا جارہا ہے وہ حرام ہے اور وہاں جانے کا مقصد صرف یہ ہو کہ وہاں پر جان پہچان کے اور لوگ بھی موجود ہوں گے ان سے ملاقات اور گفتگو مزید قربت و محبت کا ذریعہ ثابت ہوگی تو یہ صورت جائز ہے۔ لیکن یہاں یہ بات محل نظر رہے کہ اس بات کا یقین کرلیا جائے کہ ایسی دعوتوں کی سماجی نقطہ نظر سے کوئی اہمیت ہے اور اسی لئے انہیں چھوڑنے کے مقابلے میں شرکت کرلینا بہتر ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تین طرح کے لوگوں کی دعوت سے گریز کرتے تھے۔ جنہوں نے غزوہ تبوک میں شرکت نہیں کی وہ لوگ مومن و صادق تھے اور اس کے برعکس منافق و کاذب سے گریز نہیں کیا کیونکہ ان مومنین سے گریز فائدہ مند تھا اور غدار اور کاذب سمجھے جانے والوں سے گریز میں کوئی فائدہ نہیں تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے ساتھ کھانے میں شرکت اس لئے فرمائی تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے اللہ کی طرف بلاتے۔ اللہ کا جو پیغام آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے لئے لائے تھے وہ اسے سناتے۔ اس لئے سائل کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو رشتے دار دعوت دے رہا ہے اس میں سائل کی شرکت خود اسے ایسا موقع فراہم کرسکتی ہے کہ وہ لوگوں کے اور اپنے میزبان کے سامنے ایسی باتیں بیان کرے جن سے معاشرے کی اصلاح ہوتی ہو۔ کسی ایسی کتاب کا ذکر کرے یا

> اگر یہ معلوم ہو جائے کہ جس کھانے پر بلایا جا رہا ہے وہ حرام ہے تو دعوت قبول کرنا جائز نہیں۔ چوری کی ہوئی یا کسی سے چھینی ہوئی بکری کے گوشت میں شرکت کا بھی یہی حکم ہے۔

کوئی ایسا کیسٹ وغیرہ اسے پیش کرے جس سے اس کے اطوار میں بہتری پیدا ہوسکے تو اس کا سائل کو اللہ کی طرف سے اجر ملے گا اور دعوت دینے والے کی خراب کمائی کے اثرات سے وہ محفوظ رہے گا۔

سوال: — میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ میرے شوہر کا انتقال ہوچکا ہے اور ان سے میری دو بیٹیاں ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے سسرال لڑکیوں کو مجھ سے لینا چاہتے ہیں جب کہ ان کی عمر سات سال کی ہے۔ میں نے شادی نہیں کی تاکہ ان بچیوں کی تربیت کرسکوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میرے سسر کے اور لڑکے بھی ہیں جو چال چلن کے اچھے نہیں ہیں اس لئے ان کے پاس میں اپنی بیٹیوں کو چھوڑ نہیں سکتی۔ سوال یہ ہے کہ کیا سات سال کے بعد بچیوں کی حضانت کا حق مجھے حاصل ہے۔؟

جواب: — حضانت کے مقررہ شرعی حکم کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر طرفین میں کوئی مفاہمت ہوجاتی ہے اس طرح کہ احکام شرعی میں کہیں سے مخالفت نہ ہو اور بچے کو کوئی ضرر نہ پہنچے تو وہ بھی قابل قبول ہے۔ اس میں کوئی مداخلت نہیں کرسکتا۔ آپ کے اور سسر کے درمیان مفاہمت پر منحصر ہے کہ بچیاں سات سال کی عمر میں دادا کے پاس چلی جائیں یا شادی کے وقت تک ماں کی حضانت میں رہیں۔ کسی اختلاف اور تنازعے کی صورت میں ہی قانون و عدالت کا سہارا لیا جائے گا۔ جہاں معاملے کی نوعیت کے پیش نظر کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

Invitation Price Rs. 5/-
16 - 30 NOVEMBER 1995
Volume : 2, Issue : 22

The Milli Times International
49, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025 Phone:6827018/ 6926030

R.N.I. No. 57337/94
RGD. DL No.-11234/95

سکون کی تلاش

مشرق ہو یا مغرب ، شمال ہو یا جنوب مائیکل جیکسن کا نام آتے ہی موسیقی کے پرستاروں پر مسرت کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں ۔ خواہ آپ دہلی کے کسی ڈپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہو رہے ہوں یا کوالالمپور اور نیویارک کے ہنگامی Mall میں خرید و فروخت میں مصروف ہوں یا لندن اور پیرس کے کسی قہوہ خانے میں چائے نوشی میں مصروف ہوں ۔ ہر جگہ ہنگامہ خیز اور ہیجان انگیز دھکا دھک کے ساتھ مائیکل جیکسن کا نغمہ آپ کا تعاقب کر رہا ہوگا ۔ موسیقی کی دنیا میں مائیکل نے گذشتہ دہائی میں جو زبردست ناموری حاصل کی ہے یقیناً اس کا مقابلہ کسی اور شخص کے ساتھ کرنا مشکل ہے ۔

نوجوان طالب علموں اور طالبات کے دلوں میں مائیکل جیکسن کا نام آتے ہی چراغ جل اٹھتے ہیں ۔ انہیں ایسا لگتا ہے گویا مائیکل کے نغموں میں ان کی بے راہ روی کو راستہ دکھانے والا کوئی رہنما مل گیا ہے ۔ ایسا اس لئے بھی کہ مائیکل کے نغمے انہیں موجودہ دنیا سے دور بہت دور ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں قواعد و ضوابط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں ۔ زندگی کے سخت حقائق یکسر پس پشت چلے جاتے ہیں

اور ان نغموں میں بے فکر اور آزاد نسل کو پورا موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق خوب دھما چوکڑی مچائے ، ہنگامیں اٹھائے ، ہا ہو ہپ ہپ اور دھما دھم کی آوازوں کے ساتھ ایک ایسی رومانی دنیا تخلیق کرے جہاں چند لمحوں کے لئے ہی سہی موجودہ عذاب دینے والی دنیا سے فرار کا امکان پایا جاتا ہو ۔

لیکن مائیکل کے نغموں میں صرف نئی نسل کے لئے ہی کشش نہیں ہے بلکہ وہ لوگ بھی جو مغرب میں ایک عذاب جیسی زندگی جیتے رہنے سے تنگ آچکے ہیں اور جو شب و روز کی مصروفیت سے تنگ آکر سکون کے چند لمحوں کے متلاشی ہیں ، انہیں بھی ایسا لگتا ہے کہ شاید مائیکل کے نغموں میں ہی ان کے درد کا درماں ہو سکتا ہے ۔ البتہ گذشتہ دنوں جب سے مائیکل جیکسن ایک بچے سے جنسی بدسلوکی کے جرم میں مقدمات کی زد میں ہے اس کے نغموں میں سکون حاصل کرنے والوں پر بھی اس مصنوعی سکون کی اصل حقیقت واضح ہوتی جارہی ہے ۔

گذشتہ دنوں مائیکل جیکسن نے اپنے نغموں کا ایک نیا ریکارڈ سی ڈی رانگ پر جاری کیا ہے جس کا عنوان ہے "تاریخ ۔ ماضی ، حال اور مستقبل " اس موقع پر نیویارک اور لاس اینجلس میں بڑے

پیمانے پر تقاریب منعقد کی گئیں اور توقع تھی کہ نغموں کے اجراء کے یہ پروگرام بڑے ہنگامہ خیز ثابت ہوں گے ۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا ۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا شاید اس لئے ہوا کہ مائیکل جیکسن کے جنسی اسکینڈل نے اس کے وقار اور مقبولیت میں کمی کردی ہے لیکن یہ خیال اس لئے بھی صحیح نہیں کہ اپنے نغموں میں مائیکل جیکسن اخلاقیات کی تعلیم تو دیتا نہیں رہا ہے وہ سکون کی جس دنیا میں لوگوں کو گم کردینے کی کوشش کرتا رہا ہے وہ ہنگامہ ، آزادی ، اٹھا پٹخ ، دھما دھم اور وہ سب کچھ ممکن تھا جس سے سکون کی کوئی ہلکی سی امید بھی پیدا ہوتی ہو ۔ پھر مائیکل جیکسن کے جنسی اسکینڈل کے منظر عام پر آجانے سے اس کی مقبولیت کا گراف اچانک نیچے کیوں چلا گیا ؟ ۔

بات یہ ہے کہ مشرق ہو یا مغرب — عام لوگ معروف شخصیات کو جن کے وہ پرستار ہوتے ہیں انہیں کامیاب ترین اور بہت سی خوشیوں کا حامل آدمی سمجھتے ہیں ، وہ سمجھتے ہیں کہ مائیکل کا نسخہ سکون جس میں وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے کنارہ کش ہو کر چند لمحوں کے لئے ہی سہی سکون حاصل کر سکتے ہیں شاید مائیکل کا آزمودہ نسخہ ہو ۔ لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ساری دنیا کو سکون کا راستہ دکھانے والا شخص خود اپنے اندرون میں گوناگوں پریشانیوں سے دوچار ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اپنے ارد گرد کے ہنگاموں سے تنگ آکر خودکشی تک کا پلان بنا لیتا ہے تو انہیں مائیکل جیکسن کی ذاتی زندگی کے افشا ہوجانے سے دھچکا لگا ہے ۔ انہیں اس کا اندازہ نہ تھا کہ کروڑوں ڈالر میں کھیلنے والا مائیکل جیکسن سکون اور مسرت کی تلاش میں اتنا مضطرب ہے کہ کبھی خودکشی کی سوچتا ہے تو کبھی نابالغ بچوں سے جنسی تعلق کی ۔ کتنی اذیت ناک اور تکلیف دہ ہے اس کی ذاتی زندگی ۔ آخر وہ کونسی چیز ہے جس کو وہ کروڑوں ڈالر دے کر بھی نہیں خرید سکا ، پھر ہنگامہ خیز موسیقی سے آسمان سر پر اٹھانے والے پروگراموں کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے ۔

مائیکل جیکسن کے نئے کیسٹ میں جو پیغام سب سے نمایاں ہے اور جو جملہ بار بار موسیقی کی ترنگ پر گایا گیا ہے وہ ہے

THE WHOLE SYSTEM SUCKS

یعنی موجودہ نظام ہمیں نچوڑے لیتا ہے ۔ گویا مائیکل اور اس کی نسل ایک ایسے نظام میں پھنس کر رہ گئی ہے جہاں سے نجات کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی ۔ اپنے دوسرے نغمے " پیسہ " میں وہ اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے موجودہ خرچیلے معاشرے پر تنقید کرتا ہے ۔ اس نظام میں رہنے والا انسان تڑپتا ، کراہتا ، فریاد کرتا ہے کہ ہم ایک ایسے شیطانی نظام میں پھنس گئے ہیں جہاں زندگی کا مقصد خوب کمانا خوب خرچ کرنا ہے ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ساری زندگی کمانے ، خوب کھانے اور سامان تعیش جمع کرنے میں گزر جائے اور جب زندگی کی آخری منزل پر کوئی پیچھے مڑ کر دیکھے تو سخت مایوسی ہو کہ ہائے ہم کس سراب میں ساری عمر پھنسے رہے ؟ مائیکل کو خود اپنی زندگی کے خلا کا احساس ہے ۔ خود ان دنوں جب وہ مینے سوٹا کے شہر میں اپنا یہ کیسٹ تیار کر رہا تھا تو اکثر و بیشتر شام کے اوقات میں بھیس بدل کر رنگ و رونق والے بازاروں میں جا گھستا ۔ لوگ پوچھتے کہ آخر وہ بھیڑ اور ہنگامے کے وقت بازاروں میں جانا کیوں پسند کرتا ہے تو اس کا جواب ہوتا ہے کہ مجھے بھیڑ میں رہنا سکون دیتا ہے ، اچھا لگتا ہے ۔ البتہ بھیڑ میں رہنے کے باوجود جیسے وہ تنہا رہ گیا ہو ۔ زندگی اسے کاٹے دوڑتی ہے ۔ اور وہ خود کو ایسے نظام میں مبہوت پاتا ہے جہاں فرار کا راستہ صرف موت کے راستے سے ہو کر گزرتا ہو ۔

یہ درد صرف مائیکل ہی کا نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے بے شمار باسیوں کا ہے جو ایک ایسے دجالی نظام میں جکڑ دیئے گئے ہیں جہاں روزی روٹی کمانا چوبیس گھنٹے کا کام ہو گیا ہے اور جہاں زندگی کے اصل مسائل پر غور و فکر کے لئے وقت کا نکالنا اب خاصا مشکل معلوم ہوتا ہے ۔